جلد ۱۷ شمارہ ۷

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جولائی ۱۹۷۰ء

★

زیر سرپرستی

مولانا امین احسن اصلاحی

★

مدیر اعزازی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

★

مدیر مسؤل

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم-بی-بی-ایس (پنجاب) ایم-اے اسلامیات (کراچی)

★

یکے از مطبوعات

دارالاشاعۃ الاسلامیۃ لاہور

کوثر روڈ-اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - 1 (فون 69522)

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۱۷ | جون - جولائی ۷۰ء | عدد ۶،۷

★ تذکرہ و تبصرہ ....

❁ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور اسلام - - - اسرار احمد ۱

★ تدبر قرآن ....

❁ تفسیر سورۂ اعراف (۳) - - - مولانا امین احسن اصلاحی ۱۷

★ مطالعہ حدیث ....

❁ انفرادی ملکیت - - - - - - - مولانا عبدالغفار حسن ۴۷

★ یاد رفتگان ....

❁ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم - - - شجاع الدین احمد ۵۵

★ الاخبار العلمیہ ....

❁ الحاکم ابو عبداللہ نیشاپوری اور اسکی المدخل الی معرفتہ الاکلیل - پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۶۲

★ تاریخ تصوف اسلامی ....

❁ محمد ابن عبدالجبار ابن الحسن النفری صاحب کتاب المواقف و المخاطبات - پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۶۵

★ خطوط و نکات ....

❁ پاکستان کی موجودہ سیاسی کش مکش کے بارے میں ''میثاق'' کے مؤقف پر تبصرے اور مشورے! ۷۷

زر تعاون فی پرچہ - ایک روپیہ سالانہ - دس روپے

شرائط ایجنسی

★ ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے -

★ پرچہ صرف بذریعہ وی پی ارسال ہوگا -

★ کمیشن ۲۵ فی صد - محصول ڈاک بذمہ ''میثاق''

اسرار احمد   بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

تذکرہ و تبصرہ

آج سے تین چار ماہ قبل ان صفحات میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی کش مکش میں دین و مذہب کو جس طرح اچھالا جا رہا ہے اور اسلام کے نام کو جس طرح ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اس پر بھی مفصل اظہارِ خیال کریں گے اور جتنے مذہبی گروہ اس وقت سیاسی میدان میں برسرِ پیکار ہیں ان کے بارے میں بھی اپنی رائے تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے۔ گذشتہ شمارے میں یہ وعدہ بوجوہ پورا نہیں کیا جا سکا تھا۔ آج کی صحبت میں ہم اللہ کا نام لے کر اپنے اس وعدے کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم!

ان تین چار مہینوں کے دوران، اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ پاکستانی سیاست کی فضا میں "انقلابی" رنگ مسلسل کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ "انتخابی" رنگ نے لے لی ہے۔

گذشتہ شمارے میں ہم نے پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے علمبرداروں کی جانب سے کسی انقلابی جدّوجہد اور عوامی ایجی ٹیشن کے اجراء کے امکان کا تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ:

"لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کر کے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں ـــــ اور اس ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں"

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ملّتِ اسلامیہ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ـــــ چاہے اس کے ظاہری اسباب کچھ بھی رہے ہوں اور اس کا CREDIT کوئی بھی لے لے ـــ

بہر حال نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کسی فوری "انقلاب" کے امکانات تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور تمام سیاسی جماعتیں اور سارے سیاسی گروہ پوری دلچسپی کے ساتھ انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔

مسٹر بھٹو کے بارے میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ وہ خود بھی "انقلابی" سے زیادہ "سیاسی" مزاج رکھتے ہیں اور ان کی تحریک بھی "نظریاتی" سے زیادہ "قومی" رنگ کی حامل ہے —— لہٰذا انہیں تو خالص انتخابی رنگ اختیار کرنے میں کسی وقت کے پیش آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کرنا پڑا کہ انہوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے جماعتی نظم میں چند "پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو" نوجوانوں کو خارج کر کے اصل اہمیت صاحب حیثیت اور ذی وجاہت لوگوں کو دے دی —— اور خود بھی زیادہ گرماگرم اور اشتعال انگیز باتیں کہنی بند کر دیں —— (اگرچہ عوام کے جذبات اور ان کی دلچسپی کے اعتبار سے جو کمی اس طرح واقع ہو سکتی تھی اس کو بعض دوسرے FIRE BRAND مقررین[1] کی شعلہ نوائی سے پورا کرنا پڑا!) حد یہ ہے کہ سابق صدر ایوب خاں کے فیلڈ مارشل کے منصب کی بحالی ایسے اقدام پر بھی وہ مہر بلب رہے ؏

"کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

ویسے بھی صوبہ سندھ کی حد تک تو ان کی جماعت یا جمعیت پہلے ہی سے عوام سے زیادہ وڈیروں کے سہارے قائم تھی اب یہ رنگ مزید پختہ ہو گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی باہمی سیاست میں مسٹر بھٹو ہونے والے انتخابات میں کھوڑو اور قاضی فضل اللہ گروپ کا بھرپور مقابلہ کریں گے اور کیا عجب کہ انہیں شکست دینے میں بھی کامیاب ہو جائیں!

البتہ مولانا بھاشانی کا معاملہ بہت مختلف تھا اور ان کے لئے یہ قلب ماہیت اتنی آسان نہ تھی۔ چنانچہ ان کی گاڑی کو پٹڑی بدلتے ہوتے بہت سے شدید جھٹکے کھانے پڑے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس تک ان کا "انقلابی" رنگ پوری طرح قائم تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس وقت تک وہ کلیتہً اپنی جماعت کے خصوصاً مشرقی پاکستان کے انتہا پسند عناصر کے زیر اثر تھے، ٹوبہ کانفرنس میں ان کی آتش نوائی ان کے مغربی پاکستانی ساتھیوں کی اکثریت کو پسند نہیں آئی۔ ادھر مشرق میں بھی ایک قابل لحاظ عنصر انتخابات کے حق میں زور لگا رہا تھا۔ چنانچہ ان کی جماعت میں ان تین چار ماہ کے دوران بڑی رسہ کشی اور کھینچا تانی رہی —— اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی اعلان کردہ ملک گیر ہڑتال کی ناکامی میں جہاں کچھ خارجی اسباب کا دخل تھا وہاں اصل فیصلہ کن دخل اسی داخلی انتشار کو حاصل تھا۔ متعوقت رسعدم کو نہ تھا!

---

[1] جیسے مثلاً ریٹائرڈ میجر جنرل اکبر خاں

ہڑتال کی ناکامی کے بعد اس کشمکش میں رفتہ رفتہ سیاسی عناصر کا پلڑا بھاری ہوتا گیا اور مولانا بھاشانی نے پٹڑی بدلنی شروع کر دی، چنانچہ ایک طرف تو ایسٹ پاکستان بنیپ کے انتہا پسند انقلابی عناصر جن کے سرخیل مسٹر طہٰ تھے پارٹی سے کٹ گئے ——— اور دوسری طرف مولانا بھاشانی نے جو 'انقلابی سٹیم' ——— انقلابی جدوجہد کی تیاریوں کے دوران کارکنوں میں بھر گئی تھی اسے چند بے ضرر سے 'گھیراؤں' میں نکلوا کر پارٹی کے انقلابی انجن کو ٹھنڈا کر دیا ——— اور اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ مولانا خود بیمار ہو کر پارٹی کونسل کے اجلاس سے غیر حاضر ہو گئے اور کونسل نے ایک طرف انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر کے اپنی قلب ماہیت کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف مولانا بھاشانی کو تیسری بار پارٹی پریذیڈنٹ منتخب کر کے ان کی شخصیت کو بھی مجروح ہونے سے بچا لیا۔

اس طرح اصولی اعتبار سے تو اب نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں گروپوں کے مابین کوئی فرق نہیں رہا، ماسوائے اس کے کہ بھاشانی گروپ "تازہ وارد بساط سیاست" ہونے کی وجہ سے ابھی قدرے زیادہ 'نظریاتی' ہے۔ جبکہ ولی خاں گروپ ایک عرصے سے اس دشت کی بادیہ پیمائی کر رہا ہے لہٰذا قدرے زیادہ 'سیاسی' ہے لہٰذا ہماری رائے ہیں اگر ان دونوں گروپوں کے لیڈر ذاتیات سے بلند ہو سکیں تو اب جلد ہی انہیں دوبارہ باہم مدغم ہو جانا چاہیے ——— واللہ اعلم!!

بہر حال بھٹو اور بھاشانی کے سیاسی و انتخابی لائن اختیار کر لینے سے پاکستان کے سر سے کسی فوری دھماکہ خیز انقلاب کا خطرہ ٹل گیا ہے اور سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ گیا ہے ——— فللہ الحمد!!

ان تین چار ماہ کے دوران میں اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی پاکستان میں پورے زور شور سے اور مشرقی پاکستان میں کسی قدر کم قوت کے ساتھ، تحریک پاکستان کا گویا از سر نو احیاء ہو گیا ہے چنانچہ ایک طرف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور نظریۂ ملی کا راگ خوب الاپا جا رہا ہے۔ دوسری طرف "نظریۂ پاکستان" کی دہائی دی جا رہی ہے اور اس کے تحفظ کے لئے سرمایہ داروں کی تجوریوں کے منہ کھل گئے ہیں اور تیسری طرف اسلام ما اسلام کا شور بپا ہے اور بہت سے خوش گمان لوگوں کی آنکھوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی امیدوں کے سوکھے چمن میں یکبارگی بہار کی آمد کے خیال سے چمک پیدا ہو گئی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس تازہ احیاء شدہ "تحریک پاکستان" کے دل صد پارہ کے کچھ ٹکڑے کسی

کے قبضے میں ہیں اور کچھ کسی دوسرے کے ہاتھ ——— چنانچہ ایک[۱] طرف تحریکِ پاکستان کی "مذہبی رومانویت" ہے جس پر کم از کم تاحال بلا شرکتِ غیرے پوری مضبوطی کے ساتھ جماعتِ اسلامی قابض ہے اور اس میں وہ کسی کو بھی شریک کرنے کو تیار نہیں، حتیٰ کہ اس کے اصل وارثین میں سے ایک گروہ جو علماءِ دیوبند کے تھانوی و عثمانی حلقوں پر مشتمل ہے نہ صرف پوری از خود صرف کرنے بلکہ چھینا جھپٹی کرنے کے باوجود جماعتِ اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کی طرف سے اس سلسلے کی مزید کارروائی کے سدِّباب کے لئے غالباً جماعت اسلامی متحدہ اسلامی محاذ کے قیام کے لئے گفت و شنید تک سے احتراز کرے گی ——— حالی ہی میں تحریکِ پاکستان کی مذہبیت کی وراثت کا دعویدار ایک دوسرا گروپ البتہ ایسا سامنے آیا ہے جو چاہے جماعتِ اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے کلّی طور پر بے دخل نہ کر سکے۔ بہرحال اس میں سے قابلِ لحاظ حصہ ضرور بٹوا لے گا، ہمارا اشارہ بریلوی مکتبِ فکر کے علماء اور مشائخ کی اس کانفرنس کی جانب ہے جو حال ہی میں "دارالسلام" ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بڑی شان اور آن بان کے ساتھ منعقد ہوئی ہے اور جس میں متعدد مقررین نے جماعتِ اسلامی پر شدید لے دے کی ہے۔

دوسری[۲] طرف اس "مذہبی رومانویت" کے بالکل برعکس تحریکِ پاکستان کے اصل اور اساسی محرک یعنی ہندوؤں کے سیاسی، تہذیبی اور معاشی تسلط کے خوف اور اس سے بچاؤ کے جذبے کی وراثت ہے جس پر اتفاقاً ہی سہی بہرحال کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک کلیۃً مسٹر ذوالفقار علی بھٹو قابض ہو گئے ہیں تحریکِ پاکستان کا یہ "اصل باطن" اس وقت دو صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے: ایک[۱] ہندوستان دشمنی اور دوسرے[۲] عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدّ و جہد۔ ان میں سے مقدم الذکر کی علامت (SYMBOL) تو مسٹر بھٹو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہی میں بن گئے تھے اور مؤخر الذکر کی علامت وہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر بن گئے۔ اور چونکہ ایک[۱] طرف یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ تحریکِ پاکستان کے اساسی محرکات میں اصل فیصلہ کن حیثیت معاشی عوامل ہی کو حاصل تھی اور دوسری[۲] طرف اس حقیقت کا انکار بھی شدید قسم کی ڈھٹائی کے بغیر ممکن نہیں کہ اسلامی سوشلزم کا تصوّر "مصوّرِ پاکستان" علامہ اقبال کے یہاں تو پورے زور شور کے ساتھ موجود ہے ہی خود "خالقِ پاکستان" مسٹر محمد علی جناح اور ان کے دستِ راست خان لیاقت علی خاں کے یہاں بھی بصراحت مذکور[۱] ہے لہٰذا چاہے یہ کسی کو بُرا لگے چاہے بھلا، بہرحال واقعہ یہی ہے کہ تحریکِ پاکستان کی اصل "روحِ باطنی" کے وارث مسٹر بھٹو ہیں (اگرچہ مغربی پاکستان میں ہندوستان دشمنی کی راہ سے خان عبدالقیوم خاں اور مشرقی پاکستان میں اس خطّے کے معاشی حقوق کی بازیافت کے علمبردار ہوتے

[۱] صفحہ ۴۸ کے نیچے دیکھئے

کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمان بھی تحریک پاکستان کے اس جزو کی وراثت میں کسی حد تک شریک قرار دیئے جا سکتے ہیں)۔

تیسری طرف تحریک پاکستان کے اس "جسد خاکی" کی وراثت کا مسئلہ ہے جو نواب زادوں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے مرکب تھا اور دین و مذہب کے باب میں زیادہ سے زیادہ "لبرل اسلام" کا قائل تھا۔ اور اگرچہ مسلم لیگ بطور ایک وحدت کے تو کبھی کی مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکی تاہم اس کے جسد خاکی کے اجزاء ابھی موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری جماعت زبردستی تحریک پاکستان کی وراثت پر تنہا قابض ہو جائے اور مسلم لیگ کی واحد جانشین بن بیٹھے، اس لئے کہ بظاہر احوال تو تحریک پاکستان کی وراثت کے اصل مدعی وہ ہیں نہ کہ کوئی اور، (مسلم لیگ کے "باقیات الصالحات" ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان کی وراثت کے دعوے داروں میں فی الوقت مدعی اعظم کی حیثیت بلاشبہ مسٹر ممتاز محمد خاں دولتانہ اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ اگرچہ کچھ دوسرے گروپوں کا دعویٰ بھی اس بات میں بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا)۔

قصہ مختصر یہ کہ ——— اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں تحریک پاکستان کے احیاء کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے لیکن چونکہ تحریک پاکستان کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور ؎

"اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے"

کے مصداق اس کی وراثت کے مدعی بہت سے ہیں، لہٰذا چاہے "تحفظ نظریۂ پاکستان" کے نام پر بھیک کسی ایک جماعت ہی کو زیادہ مل جائے، انتخابات کے میدان میں تحریک پاکستان کے اس حالیہ احیاء کے ثمرات بہت سی سیاسی جماعتوں کے مابین تقسیم ہوں گے اور کوئی ایک جماعت چاہے وہ کوئی سی بھی ہو ان سے بلا شرکت غیرے متمتع نہیں ہو سکتی! ——— !!

"مذہبی رومانویت" کی اصطلاح ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے بالکل اجنبی ہو اور وہ اس سے ناخوش بھی ہوں اس لئے وضاحتاً عرض ہے کہ یہ "ایجاد بندہ" نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے اس اصطلاح کو مسلم ہندوستان کے زمانۂ حاضر کے سب سے بڑے مورخ شیخ محمد اکرام صاحب نے مسلمانانِ ہند کی ماضی

قریب کی تاریخ کے اس دور کی کیفیت کی تعبیر کے لئے استعمال کیا تھا جس میں مسلمانوں کی قیادت کچھ صحافی قسم کے لیڈروں کے ہاتھ آ گئی تھی جنہوں نے ملتِ اسلامیہ ہند کو حقائق کا مردانہ وار (FACE) کرنے کی بجائے تصوّرات و جذبات کی دنیا میں رہنا سکھایا اور گویا زمین پر قدم بہ قدم چلانے کی بجائے ہوا میں اڑایا اور فضا کی پہنائیوں کی سیر کرائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے اس کے کہ قوم میں محنت و مشقت ایثار و قربانی اور جہد مسلسل و سعیِ پیہم کا مادّہ پیدا ہوتا اسے اکثر و بیشتر تصورات کے حسین خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہنے اور کبھی کبھی ہڑبڑا کر اٹھنے اور جوش و ہیجان میں کچھ نعرے لگا کر پھر خوابِ خرگوش میں مبتلا ہو جانے کی عادت پڑ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا "کامریڈ" اس مرض کی صرف ابتدائی علامات کا مظہر تھا —— مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے "الہلال" اور "البلاغ" میں یہ مرض اپنی پوری شدت کو پہنچا اور وہیں سے اس کی چھوت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو لگی جنہوں نے "ترجمان القرآن" کے ذریعے اس طرز کی صحافیانہ قیادت کے تسلسل کو برقرار رکھا —— اور یہ تو اس "سلسلۃ الذہب" کی صرف متصل کڑیاں ہیں، ان کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں اس کی اور بھی شاخیں پھوٹیں۔ جیسے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا "زمیندار"۔ وقس علیٰ ہذا۔

اس صحافیانہ قیادت نے ایک طرف مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ کی داستانیں سنا کر نشاد کام کیا اور "پدرم سلطان بود" کے نشے میں مبتلا کر دیا اور دوسری طرف حکومت الہٰیہ کے قیام اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے بلند ترین نصب العین تو عطا کئے لیکن اس کے لئے کسی عملی نہج کو نہ واضح کیا نہ اس کی داغ بیل ڈالی۔ نتیجۃً پوری قوم پر مذہبی رومانویت کی سی کیفیت طاری ہو گئی جس کا تعلق ہوش سے زیادہ جوش سے اور عمل سے زیادہ تصور سے تھا۔

مولانا ابوالکلام مرحوم نہایت ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ سب ہوائی رومان ہے، حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نتیجۃً انہوں نے جلد ہی قیام حکومت الہٰیہ کے "آسمانی" نصب العین سے دست کش ہو کر غیر ملکی سامراج سے آزادی کے حصول کا حقیر سا "زمینی" نصب العین اختیار کر لیا۔ اور بقیہ زندگی خاموشی کے ساتھ اس کی تحصیل میں کھپا دی —— اس موقع کو غنیمت جان کر مولانا مودودی آگے بڑھے اور انہوں نے مولانا ابوالکلام کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو سنبھال لیا۔ اور اس مذہبی رومان میں مزید رنگ آمیزی شروع کر دی۔ لیکن "بدقسمتی" سے اسی زمانے میں مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک زور پکڑ گئی اور اس نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے مذہبی رومان کی قیادت خود سنبھال لی اور اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن، اسلامی قانون

وغیرہ اصطلاحات کا استعمال کثرت سے شروع کر دیا اور اس طرح وہ زمین جس پر مودودی صاحب اپنی قیادت کے قصر کی تعمیر کے خواب دیکھ رہے تھے مسلم لیگ کے قبضے میں چلی گئی، تب مودودی صاحب کو ہوش آیا اور انہیں حقائق نظر آنے لگے اور انہوں نے یہ کہہ کر کہ اس قسم کی قومی تحریکوں سے کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی[۱] اس کا نویس "ایک ہی مخصوص" طریقہ ہے، مسلمانوں کی قومی تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس "ایک ہی مخصوص" طریق[۲] پر کام شروع کر دیا۔

---

[۱] اس خام خیالی (LOOSE THINKING) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو لیکن خالص علمی (SCIENTIFIC) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوتی ہے ۔۔۔۔"

اقتباس از "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے" تحریر مولانا مودودی

[۲] اس مخصوص طریق کے ابتدائی ناگزیر لوازم (PRE - REQUISITES) کا بیان مودودی صاحب ہی کے الفاظ میں سنیئے :

" درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی اس کے پیدا ہونے کے لئے ناگزیر ہے کہ ابتداً ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے مستعد ہوں ۔۔۔ پھر وہ اپنی جد و جہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں ۔۔۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام لے کر اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے، اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین سیاست ۔۔۔ غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کریں۔ اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے خدا ناشناس ائمۂ فکر کے مقابلے میں اپنی عقلی و ذہنی قیادت (INTELLECTUAL LEADERSHIP) کا سکہ جما دیں ۔۔۔۔۔۔" (ایضاً)

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کی اس مذہبی رومانویت کو خوب استعمال[1] (EXPLOIT) کیا اور اس کے بل پر اپنی اس حیثیت کو تسلیم کرا لیا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ لیکن رومان بہرحال رومان ہی ہوتا ہے، پاکستان کے قیام کے بعد جلد ہی اس حسین خواب کا بھانڈہ چوراہے میں پھوٹ گیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ع "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!" —— لیکن ابھی اس غبارے کی پوری گیس نکلنے نہیں پائی تھی کہ مودودی صاحب کی ذہانت نے ان کے سامنے "قیادتِ عظمیٰ" کا ایک اور موقع لا کھڑا کیا اور وہ اپنے اس "ایک ہی مخصوص طریقِ کار" کو چھوڑ چھاڑ لنگر لنگوٹ کس کر مذہبی رومانویت کے اس غبارے میں ازسرِنو گیس بھرنے اور اس کے سہارے اپنی قیادت کے پھریرے اڑانے کے لئے میدان میں آ گئے۔ اوّل اوّل انہیں اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن ع "پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!" کے مصداق وہ تندہی کے ساتھ کام میں لگے رہے تاآنکہ آج نہ صرف یہ کہ پاکستان میں تحریکِ پاکستان کی مذہبی رومانویت کا ازسرِنو دور دورہ ہے بلکہ اس کی وراثت پر مودودی صاحب اس طرح قابض ہیں کہ اس کے اصل اور جائز وارثوں تک کو اپنا جائز حق وصول کرنا اور مودودی صاحب کو اس قبضۂ غاصبانہ سے بے دخل کرنا مشکل نظر آ رہا ہے !! —— !!

"تاہم جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں "قیادتِ عظمیٰ" کے خواب کی تعبیر ابھی کہیں آس پاس نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اوّلاً تو تحریکِ پاکستان کی مذہبی رومانویت کے جائز وارث بھی میدانِ عمل میں آ گئے ہیں اور دوسرے اس تحریک کے بعض دوسرے اجزاء بھی تھے جن کی وراثت دوسروں کو منتقل ہو چکی ہے —— ادھر نہ صرف یہ کہ صحت اور قوت کار جواب دے چکی بلکہ عمر کا سفینہ بھی ساحل سے زیادہ دور نظر نہیں آتا —— الغرض ع : اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت جو مذہبی گروہ یا جماعتیں برسرِکار ہیں ان میں سب سے

---

[1] یہی وہ وقت تھا جبکہ بریلوی مکتبِ فکر کے علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد اور دیوبندی مکتبِ فکر کے تھانوی اور عثمانی حلقے اس رومانی غبارے میں مزید ہوا بھرنے کے لئے میدانِ عمل میں آ گئے —— چنانچہ اسی بنا پر ہم نے صفحاتِ گذشتہ میں ان ہی دونوں حلقوں کو تحریکِ پاکستان کی مذہبی رومانویت کی وراثت کے حقیقی دعویدار قرار دیا ہے۔

نمایاں تو مودودی صاحب کی جماعت اسلامی ہی ہے، دوسرے نمبر پر جمعیت علمائے اسلام ہے جس کی قیادت مولانا درخواستی، مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کر رہے ہیں ——— اور ان کے بعد چند متفرق مذہبی گروہ ہیں جو مسلک و مزاج کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی مختلف ہوں سیاسی موقف کے اعتبار سے ملت واحدہ ہیں یعنی مرکزی جمعیت علماء اسلام، جمعیت اہل حدیث اور بریلوی مکتب فکر کے علماء و مشائخ کے مختلف گروپ۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر متفرق گروہوں کا تعلق ہے ہمیں ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ اس لئے بھی کہ سیاست ان کا مستقل مشغلہ نہیں ہے بلکہ سیاست سے ان کی دلچسپی صرف موسمی .. .. .. (SEASONAL) قسم کی ہے۔ ان کا اصل اور مستقل شغل درس و تدریس اور اپنے اپنے ہم خیال فرقوں کی مذہبی پیشوائی ہے جس کے ذیل میں مدارس و مکاتب کے قیام و انتظام، مساجد کی امامت اور اپنے اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ و تلقین میں یہ حضرات پوری طرح مصروف رہتے ہیں اور اس لئے بھی کہ ان کی یہ موسمی سیاست بھی تضادات اور قلابازیوں سے خالی ہے ——— آج سے پچیس سال قبل بھی یہ حضرات قومی سیاست کا مذہبی ضمیمہ بن گئے تھے ——— اور آج پھر انہوں نے یہی رول اختیار کر لیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت قومی سیاست کی علمبردار جماعت ایک ہی تھی لہٰذا یہ سب متفقہ طور پر اس کے معاون و مددگار بن گئے تھے اور اب قومی سیاست کئی دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے لہٰذا ان کا تعاون بھی منقسم ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کی اکثریت تو مرحوم مسلم لیگ کے صلبی وارثوں کے مختلف گروہوں ہی کی مدد کرے گی۔ ایک قدر قلیل شاید تحریک مسلم لیگ کی معنوی وارث یعنی جماعت اسلامی کا ساتھ دے دے ——— اسلام اور سوشلزم کی ہوائی جنگ میں چونکہ ان سب گروہوں نے متفقہ طور پر جماعت اسلامی کا ساتھ دیا تھا لہٰذا جماعت اسلامی کو توقع ہو گئی تھی کہ شاید انتخابات میں بھی وہ ان سب کی متفقہ حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے لیکن جونہی وہ ہوائی جنگ ختم ہوئی اور انتخابات کی بساط بچھنی شروع ہوئی اس متحدہ اسلامی محاذ کے شرکا کے رخ بھی تبدیل ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ اب اتحاد و اتفاق کے لئے کبھی کراچی اور کبھی لاہور میں مذاکرات تو منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن بات نہ کسی طور بن رہی ہے نہ بن سکے گی۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی کی مرکزی جمعیت علماء اسلام بالواسطہ یا بلا واسطہ کونسل مسلم لیگ کا ساتھ دے گی اور بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ کی اکثریت اپنے اپنے علاقوں میں لیگ ہائے ثلاثہ میں سے زیادہ تر دوسری دو مسلم لیگوں سے منسلک زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کو مضبوط کرے گی جبکہ جمعیت اہل حدیث کی تازہ نوجوان قیادت اور جمعیت

علماء پاکستان سے صرف نعیمی گروپ کی حمایت جماعت اسلامی کو حاصل ہو جائے گی —— واللہ اعلم !!

پاکستان کے سیاسی میدان کے اصل اور مستقل مذہبی کھلاڑی درحقیقت دو ہی ہیں یعنی مودودی جماعت اور ہزاروی جمعیت —— اور اگرچہ فی الوقت یہ دونوں بالکل مخالف کیمپوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر معاملات میں ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں تاہم ان دونوں کے مابین بعض امور مشترک بھی ہیں :

مثلاً ایک یہ کہ قبل از تقسیم ملک و قیام پاکستان ان دونوں کی راہیں مسلمانان ہند کی مجموعی قومی سیاست سے جدا تھیں —— ایک گروپ کانگرس کا حامی و حلیف تھا اور دوسرے نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بالکل ہی الگ بنائی تھی (اگرچہ اس اتفاق میں بھی اختلاف کا ایک رنگ موجود تھا یعنی یہ کہ مودودی صاحب نے ابتدا میں کچھ عرصے تک کم از کم نظری اور کاغذی حد تک قومی سیاست کا ساتھ دیا تھا —— اور اس زمانے میں جمعیت علماء ہند کے موقف پر شدید اور نہایت تلخ تنقیدیں کی تھیں جن کی یاد فریق ثانی کے ذہن سے کسی طرح محو نہیں ہو سکتی !)

دوسرے یہ کہ قیام پاکستان کے بعد یہاں کی قومی قیادت کے مقابلے میں بھی ان دونوں کا رویہ ایک جیسا رہا اور دونوں نے ہر ممکن طریق پر قومی قیادت کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جبکہ جماعت اسلامی نے بزعم خویش قومی قیادت کے حریف کی پوزیشن سنبھال لی تھی اور وہ اس کی جگہ لینے کے لئے مثبت طور پر جارحانہ پیش قدمی کر رہی تھی وہاں جمعیت اور اس کے ہم خیال علماء کی روش اکثر و بیشتر صرف عدم تعاون اور ترک موالات کی قسم کی PASSIVE RESISTANCE تک محدود رہی تاہم نتیجہ تقریباً ایک ہی رہا اور اکثر معاملات میں یہ دونوں گروہ چاہے برضا و رغبت چاہے بادل ناخواستہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہے چنانچہ انٹی قادیانی موومنٹ میں جماعت کو مجبوراً احرار اور جمعیت علمائے اسلام کے پیچھے لگنا پڑا —— اور دوسری طرف پاکستان کے پہلے دس گیارہ سالوں کے دوران اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے مطالبے اور دوسری دہائی کے دوران سابق صدر ایوب خاں کی مخالفت میں اکثر جمعیت جماعت کا ساتھ دیتی رہی حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو حیرت انگیز حد تک اشتراک عمل رہا۔ مثلاً ۱۹۶۷ء میں عید الفطر کے موقع پر اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف ایجی ٹیشن میں۔

تیسرے یہ کہ دونوں ہی نے احیائے دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے باب میں صرف نعروں پر اکتفا کی اور اس کے لئے کسی مثبت تعمیری کام کی داغ بیل نہیں ڈالی۔ اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری

جماعت اسلامی پر عاید ہوتی ہے اور اصل گلہ اسی سے ہے ، اس لئے کہ جیسا کہ صفحات گذشتہ میں دیئے ہوئے اقتباس سے ظاہر ہے وہ علمی و فکری انقلاب ہی کے نام پر قومی تحریک سے علیحدہ ہوئی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی کسی حد تک صلاحیت بھی اس نے اپنے اندر قیام پاکستان سے قبل کے پانچ چھ سالوں میں پیدا کر لی تھی ـــــ لیکن افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد اس نے یہ ساری بساط تہ کرکے رکھ دی اور ساری صلاحیتوں اور قوتوں کو سیاسی میدان میں جھونک دیا۔ رہی جمعیت علماء تو اس غریب نے نہ کبھی اس کا دعویٰ کیا اور نہ ہی علوم و فنونِ جدیدہ سے بُعدِ شدید کی بنا پر اس میں ایسے کسی کام کی صلاحیت ہی ہے !! لہٰذا اس سے نہ کبھی اس کی کوئی توقع تھی نہ اب کوئی گلہ ہے ! ـــــ !!

ان چند مابہ الاشتراک امور کے سوا ہر اعتبار سے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے یہ دونوں مذہبی پہلوان ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور ہوتے ہوتے ان کے عناد اور بغض نے انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے حتیٰ کہ اب جس شدید نوعیت کی عداوت ان دونوں کے مابین ہے اس کی مثال نہ دوسری سیاسی جماعتوں میں مل سکتی ہے نہ مذہبی گروہوں میں ۔

سیاسی امور میں ان کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کے تذکرے سے قبل اس حقیقت کی جانب اشارہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ان دونوں کا مذہبی رنگ بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ کسی گذشتہ اشاعت میں ہم ضمنی طور پر حاشیے میں یہ جملہ لکھ بیٹھے تھے کہ " جماعتِ اسلامی کا مذہبی رنگ ہلکا اور سطحی ہے اور قدامت پسندی اور جدّت پسندی کا ملغوبہ ، جبکہ جمعیت علماء اسلام کا مذہبی رنگ نہایت گہرا بھی ہے اور خالص قدیم اور روایتی بھی ! " جس پر بہت سے لوگوں حتیٰ کہ ہمارے بعض بزرگوں اور کرم فرماؤں نے بھی ناک بھوں چڑھائی حالانکہ یہ ایک روزِ روشن کے مانند عیاں حقیقت ہے جس کا انکار بالکل آنکھیں بند کرکے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیۃ علما اسلام کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو پرانے سند یافتہ اور مسلّمہ علماء ہیں اور سالہا سال سے درس و افتاء کی مسندوں پر رونق افروز ہیں جبکہ جماعت اسلامی کے قائد نے کچھ ادھر اور کچھ ادھر سے پڑھ پڑھا کر زیادہ تر اپنی انشاپردازی کے بل پر " مفکرِ اسلام " ہونے کا مقام حاصل کیا ہے ؟ پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیت

لہ چنانچہ امیر جمعیت مولانا درخواستی کی تقریروں میں دسیوں حدیثیں متن ہی نہیں سند سمیت بیان ہوتی ہیں جبکہ امیر جماعت مولانا مودودی آیاتِ قرآنی کی تلاوت تک سے کترا کر محض ترجمے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ثقہ راوی کی روایت ہے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ کے فوراً بعد جماعت کے موجودہ قیم صاحب کا نکاح پڑھاتے ہوئے مودودی صاحب سورۂ نساء کی پہلی آیت ہی بھول گئے تھے اور کسی کے یاد دلانے ہی پر وہ آیت انہیں یاد آئی تھی ـــــ !!

علماءِ اسلام کے کارکنوں کی ایک عظیم اکثریت درسِ نظامی کے فارغ شدہ علما پر مشتمل ہے یا زیرِ تعلیم طلبہ پر جبکہ جماعتِ اسلامی کی اصل قوت سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی اکثریت ناظرہ قرآن مجید تو شاید پڑھ لے کسی ایک حدیث کے متن تک کو صحیح نہیں پڑھ سکتی۔ پھر ظاہری وضع قطع اور تراش خراش کے اعتبار سے بھی ان دونوں کے مابین عظیم تفاوت ہے اس سلسلے میں فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا ایک موقع حال ہی میں لاہور میں پیش آیا۔ پچھلے دنوں یہاں ایک جلوس جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام "اسلام پسندوں" کی قوت کے مظاہرے کے لئے نکالا گیا۔ اور دوسرا جمعیت علماء اسلام نے اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے نکالا۔ پہلے جلوس کے قائدین میں بھی چار میں سے صرف ایک باریش تھے اور شرکاء میں بھی بمشکل پانچ فی صد داڑھی والے تھے اور ان میں سے بھی زیادہ سے زیادہ ایک فی صد کی داڑھی فقہی معیار پر پوری اترتی تھی جبکہ دوسرے جلوس کے قائدین اور شرکا سب کم از کم پچانوے فی صد مکمل شرعی وضع قطع کے حامل تھے[1] ——— باقی رہا نظریات و افکار کا معاملہ تو مودودی صاحب خود تجدد پسندوں اور قدامت پرستوں کے مابین "بیچ کی راس" کے آدمی ہونے کے مدعی ہیں جبکہ جمعیت علماء اسلام ہے ہی ان علماء پر مشتمل جن کو قدامت پرستی اور جمود کے طعنے دیئے جاتے ہیں ——— تو پھر ہم نے اپنے اس پہلے میں آخر اور کون سا زہر گھول دیا تھا؟

سیاسی موقف کے اعتبار سے جماعت اور جمعیت کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے، تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد تین امور پر قائم ہے:

ایک یہ کہ عالمی سیاست کے میدان میں جمعیت علماء اسلام مغربی سامراج کی جانی دشمن ہے ——— اور اس کی بیخ کنی کے لئے وہ کسی بھی دوسری طاقت سے تعاون کو درست سمجھتی ہے[2] جبکہ جماعتِ اسلامی کی رائے میں چونکہ مغربی الحاد نے کسی نہ کسی حد تک دین و مذہب کے ڈھانچے کو بھی قائم رکھا ہے اور مغربی جمہوریت میں رائے کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے لہٰذا کمیونسٹ بلاک کے مقابلے میں مغربی طاقتیں کم تر درجے کی برائی ہیں۔

---

[1] ان جلوسوں کے مابین ایک اور نمایاں تفاوت جس کا براہ راست تعلق جماعت اسلامی سے نہیں ہے یہ تھا کہ "شوکت اسلام" کے جلوس پر نعرہ تکبیر پر نعرہ رسالت حاوی تھا اور کہیں کہیں سے نعرہ حیدری کی آواز بھی سنی جاتی تھی جبکہ جمعیت علمائے اسلام کے جلوس میں دینی نعروں میں سے نعرہ تکبیر کے سوا کوئی اور نعرہ سننے میں نہیں آیا۔ [2] حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرے[۲] یہ کہ بین الاسلامی اور خصوصاً بین العرب سیاست میں جمعیت کی تائید اور ہمدردیاں ان ممالک کے ساتھ ہیں جنہوں نے بادشاہتوں کے تختے الٹ کر سوشلسٹ یا نیم سوشلسٹ نظام اختیار کر لئے ہیں ——— اور روس کی امداد کے سہارے مشرق وسطیٰ میں امریکی سامراج کے مظہر اعظم اسرائیل کے خلاف مصروف پیکار ہیں ——— جبکہ جماعت اسلامی ان ممالک کی موید اور حامی ہے (اور ان کی سرپرستی سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے) جہاں ابھی ملوکیت قائم ہے اور جو سوشلزم کی مخالفت کے پردے میں امریکہ کی حمایت کا دم بھر رہے ہیں۔

تیسرے ملکی سیاست کے میدان میں حال ہی میں دائیں اور بائیں بازو کی جو تقسیم عمل میں آئی ہے اس میں جمعیت علماء اسلام بائیں بازو کی حامی ہے اور عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کے ساتھ اس کا باقاعدہ معاہدہ ہو چکا ہے اور بائیں بازو کی دوسری تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ اس کا اتحاد کسی بھی وقت اور کسی بھی صورت میں ممکن ہے ——— جبکہ جماعت اسلامی نے سوشلزم کی مخالفت کو اسلام اور کفر کی جنگ کا درجہ دے کر دائیں بازو کی انتہا پسند جماعت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ملک کے سرمایہ دار طبقات کو اپنی نجات صرف اسی سے وابستہ نظر آتی ہے اور ان کی تجوریوں کے منہ اس کے "تحفظ نظریہ پاکستان فنڈ" کے لئے کھل گئے ہیں۔

بات تو درحقیقت بس اتنی سی ہے جو اوپر بیان ہوئی لیکن شدت مخالفت میں یہی اختلافات اس صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں کہ جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حلقوں کی جانب سے جمعیت پر کانگریسی مولویوں کی پھبتی کے علاوہ سوشلزم اور کمیونزم کے لیبل ہی نہیں کفر کے فتوے تک چسپاں کئے جا رہے ہیں۔ اور جمعیت کی طرف سے جماعت اور ان کے ہم نواؤں کو امریکہ کے پھٹو، سامراج کے آلہ کار، یہودیوں کے کارندے اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ ایسے خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ہم نے آج سے پورے ڈیڑھ سال قبل جبکہ پاکستانی سیاست کے موجودہ ہنگامہ خیز دور کی ابتدا ہوئی ہی تھی، ان صفحات میں کچھ گذارشات پیش کی تھیں جن سے جمعیت کے مذکورہ بالا سیاسی موقف کے تاریخی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ہم قارئین 'میثاق' کی یاد دہانی کے لئے اس کے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں :-

---

[۲] حاشیہ صفحہ گذشتہ : درحقیقت یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت ماضی میں جمعیت علماء ہند نے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا تھا۔

"گذشتہ دو ڈھائی سال کے دوران تدریجاً ایک اور قوت بھی پاکستانی سیاست کے منظر عام پر نمودار ہوتی ہے۔ ہماری مراد جمعیت علمائے اسلام سے ہے جس نے اس عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی قوت بہم پہنچالی ہے اور اپنے منتشر اثرات کو خاصے مضبوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کر لیا ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ اپنی ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے دوسری تنظیموں مثلاً جماعت اسلامی سے بہت مختلف انداز کی ہے (مثلاً اس کے یہاں کاغذی کارروائی اور دفتری نظام تشاید بالکل ہی دقیانوسی اور (PRIMITIVE) طرز کا ہو) لیکن ایک مشترک ذہنی ساخت اور مشترک انداز فکر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ماضی کے ورثے کی بنا پر اس گروہ نے بہت جلد ایک نہایت منظم اور فعال فطری تنظیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام میں اس کی جڑیں انتہائی زیریں سطحوں (SUBSTRATA) تک گہری اتری ہوئی ہیں۔ دینی مدارس اس کے مستقل مراکز اور اللہ کے گھر اس کے مستقل دفاتر ہیں۔ اس کے عام کارکن ہی نہیں اکابر تک سب خالص عوامی کارکن ہیں۔ سادگی، دینداری اور غایت درجہ خلوص کے ساتھ نہایت زوردار جذبۂ عمل اس کے شعائر ہیں۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر یہ اندازہ قطعاً مبالغے پر مبنی نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کی سیاست میں جمعیت علمائے اسلام نہایت موثر رول ادا کرے گی۔

۴۸ انہی صفحات میں چند ماہ قبل یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ گروہ ذہناً و قلباً خالص حسینی ہے یعنی علمائے دیوبند کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرگروہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی تھے اس طرح ان کا تعلق تحریک آزادی ہند و استخلاص وطن کے اس قدیم و عظیم سلسلے سے جا ملتا ہے جو تحریک شہیدین سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی سے ہوتا ہوا اور پھر تحریک خلافت اور ریشمی رومالوں کی تحریک ایسی دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے گذر کر بالآخر جمعیت علمائے ہند پر ختم ہوا تھا اور اس پورے عرصے میں اسلامیان ہند کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔ آزادی ہند سے متصلاً قبل مسلمانان ہند کی ایک عظیم اکثریت نے اس گروہ کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا[1]۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اوّل اوّل اس طبقے پر شکست کا سا احساس طاری رہا اور ان حضرات نے ایک عرصے تک حلقہ دیوبند کے ان دوسرے اکابر کی سیادت قبول کر لی جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا گوشۂ عافیت میں پناہ لئے رکھی ۵۲/۵۳ء میں مجلس احرار اسلام نے جو عظیم سیاسی ایجی ٹیشن برپا کیا تھا اس کی پشت پر اصل

[1] اس اہم موضوع پر ہم مفصل اظہار خیال مارچ ۱۹۶۷ء کے تذکرہ و تبصرہ میں کر چکے ہیں۔

قوت اسی گروہ کی تھی اس کے فوراً بعد جب پاکستانی سیاست میں انتشار برپا ہوا اور مسلم لیگ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل نہ رہی تو اس گروہ نے بھی اپنی حامی مسلم لیگ قیادت کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور خالصتاً اپنا اصل اور قدیم رنگ اختیار کر لیا۔

اس وقت سے اب تک اندر ہی اندر ان کی تنظیم وسعت اختیار کرتی رہی اور اس کے کارکنوں میں جوش و جذبہ بیدار ہوتا رہا ——— گذشتہ سال ان کی جو کانفرنس[1] لاہور میں موچی دروازے کے باہر ہوئی تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جلد ہی جمعیت پاکستان کی عملی سیاست میں مؤثر طور پر دخیل ہو گی ——— اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مارشل لا کے بعد سے جو سکوت و سکون پاکستانی سیاست پر طاری تھا اور لوگ جس طرح سہمے سہمے سے تھے اس میں پہلی ہلچل اور اوّلیں سیاسی سرگرمی جمعیت ہی کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ ہماری مراد اس کامیاب ایجی ٹیشن سے ہے جو ڈاکٹر فضل الرحمان کی کتاب کے خلاف برپا ہوئی تھی اور جس سے چھٹکارا پانے کے لئے حکومتِ وقت کو ڈاکٹر صاحب موصوف کو قربانی کا بکرا بنانا پڑا تھا!

اس گروہ کے بارے میں اہم ترین بات جو نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے اور چاہے اس کا سبب معزنی استعمار سے شدید نفرت کا وہ قدیم جذبہ ہو جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا ہے اور گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے، چاہے یہ واقعہ ہو کہ چونکہ یہ خود ایک خالص عوامی قوت ہیں لہٰذا عوام کی دقتوں اور مشکلات کا قریبی احساس رکھتے ہیں اور چاہے یہ ہو کہ ماضی میں ان کا اشتراکِ عمل جس عظیم سیاسی تحریک کے ساتھ رہا ہے (ہماری مراد ماضی کی انڈین نیشنل کانگرس سے ہے!) اس پر بالعموم سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا ——— سبب یا اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بہرحال واقعہ یہی ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے اور چاہے اس کے اکابر و رہنما خالص اور بے آمیز اسلام ہی کے علمبردار ہوں اس کے کارکنوں میں کثیر تعداد ایسے جوشیلے لوگوں کی شامل ہے جو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند نظری طور پر درست اور بحالات موجودہ عملاً لازمی خیال کرتے ہیں ——— !

یہی وجہ ہے کہ شرق اوسط کی سیاست میں بھی یہ حضرات صدر ناصر کے حامی و موید اور شاہ فیصل کے ناقد و مخالف ہیں ——— اور تازہ سیاسی ہنگامے میں بھی ان کی شرکت اوّلاً نیشنل عوامی پارٹی اور بھٹو صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ ہوئی ہے۔" (میثاق جنوری ۶۹ء)

گویا کہ ——— جمعیت علماء اسلام کا عوامی مزاج اور سامراج دشمن کردار ہر گز حادث نہیں بلکہ نہایت قدیم

ہے اور اپنی پشت پر ایک طویل تاریخ اور شاندار ماضی لئے ہوئے ہے اور بعض لوگوں کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے کہ اس کا موجودہ رویہ صرف جماعتِ اسلامی کی مخالفت کا نتیجہ یا ذاتی طور پر مودودی صاحب کی دشمنی کی پیداوار ہے۔

مئی ۱۹۶۸ء کی جس کانفرنس کا تذکرہ اوپر ہوا ہے اس کے تقریباً دو سال اور ایک ماہ بعد پھر ایک عظیم الشان "آئینِ شریعت کانفرنس" لاہور میں جون کے آخری ہفتے میں جمعیت کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اکابر و عام کارکن دونوں نہایت سخت جان اور واقعۃً آہنی چنوں کے مانند ہیں اس لئے کہ گذشتہ تقریباً ایک سال سے ملک کے تمام مذہبی عناصر متحد ہو کر ان کی مخالفت پر کمر بستہ رہے ہیں اور انہوں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں بدنام کرنے اور عوام کو ان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے قدم آگے ہی بڑھ رہے ہیں ——— اور تازہ ترین اضافہ یہ ہوا ہے کہ جس طرح جماعت اسلامی گذشتہ تقریباً دس سال سے صدر ناصر اور عالم عرب کی عوامی تحریکوں کی دشمنی اور ان کے خلاف شدید زہر آلود پروپیگنڈے کی قیمت عرب بادشاہوں اور امیروں کی 'سرپرستی' کی صورت میں وصول کرتی رہی ہے اسی طرح اب جمعیت بھی عرب ممالک کے فریقِ مخالف کی نگاہوں میں آ گئی ہے اور اسے بھی کچھ نہ کچھ 'سرپرستی' ضرور حاصل ہو جائے گی۔

ان حضرات پر "کانگریسی مولوی" کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے اس لئے کہ اس کی اوّلین زد مولانا حسین احمد مدنی رحؒ ایسے اکابرِ ملت، مجاہدینِ حریت اور زعمائے دین پر پڑتی ہے جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم و فضل، تقویٰ و تدیّن، خلوص و بے نفسی، عزم و ہمت، جانفشانی و تندہی، قربانی و ایثار اور علم و تواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہند کی ماضی قریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی ——— مولانا مدنی رحؒ کی زیارت کا شرف ہماری گنہگار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن اُن کی اس "کرامت" کا مشاہدہ ہم نے بچشم سر کیا ہے کہ کتنے ہی مخلص اور متدیّن لوگوں کی آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوؤں کا دریا بہہ نکلتا ہے ——— اور حلقہ دیوبند کے مدارس کی وہ زیرِ تعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا نہ سنا، ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اور ذاتی طور پر ہمارے لئے تو سب سے بڑی شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کی ہے جن کے الفاظ میں "مولانا مدنی رحؒ صرف اپنی سیاسی رائے کے سوا ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے[1]۔"

(بقیہ صفحہ ۸۱ پر)

---

[1] اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ: جن دنوں کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش زوروں پر تھی اور مولانا مدنی رحؒ اور ان کے رفقاء تنقید و استہزاء (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تدبر قرآن
مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ اعراف

۶- آگے کا مضمون- آیات ۴۴-۵۳

آگے وہ سوال و جواب مذکور ہوا ہے جس کا تبادلہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان ہوگا۔ اہل جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے سب پورے ہوئے، تم بتاؤ، تم نے بھی وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا یا تمہیں جس کی تمہیں خبر دی گئی تھی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں سب دیکھ لیا۔ اس کے بعد ایک منادی ان پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا۔

پھر یہ بیان ہوا ہے کہ اعراف کی برجیوں سے رجال امت کے ایک گروہ کو جنت و دوزخ کے احوال کا مشاہدہ کرایا جائے گا کہ وہ دیکھ لیں کہ اللہ کے جن وعدوں کے لئے وہ جئے اور مرے وہ کس طرح پورے ہوئے۔ یہ اصحاب الاعراف اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کو ان کی علامات امتیاز سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ اہل جنت کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دیں گے اور اہل دوزخ کے قائدین کو پھٹکاریں گے کہ بتاؤ تمہاری ساری جمعیت اور تمہارا سارا عزہ کیا کام آیا، تم قسمیں کھا کھا کے جن کے باب میں یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے، وہ کہاں ہیں اور تم کہاں بھاڑ جھونک رہے ہو؟

اس کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ اہل دوزخ پانی کے لیے تراہ تراہ کر رہے ہوں گے اور اہل جنت سے فریاد کریں گے کہ کچھ ادھر بھی نظر کرم کرو لیکن وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل دوزخ کے لیے ان چیزوں کی مناہی کر رکھی ہے۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ جنت و دوزخ کا جو احوال سنایا جا رہا ہے، یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کو آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب اتاری جس میں اپنے علم قطعی کی روشنی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی تفصیل سنا دی ہے تاکہ جو ایمان لانا چاہیں وہ اس ہدایت کو اختیار کر کے اپنے آپ کو رحمت کا سزاوار بنا لیں لیکن یہ اپنی رعونت کے سبب سے منتظر ہیں کہ جب یہ ساری باتیں واقعات کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گی تب ان کو مانیں گے لیکن وہ وقت ماننے کا نہیں ہوگا بلکہ سر پیٹنے کا ہوگا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۴ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝۴۵ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۭ وَعَلَي الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْٓا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝۴۶ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَاۗءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۴۸ اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۴۹ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاۗءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَاۗءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۵۱ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰي عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۲ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ

نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۵۳

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم نے تو جو کچھ ہم سے ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا بالکل سچا پایا، کیا تم نے بھی جو کچھ تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا اس کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے، ہاں! پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر — اُن پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ۴۵

اور ان کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہل جنت کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر اللہ کی رحمت و سلامتی ہو۔ وہ اس میں ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن متوقع ہوں گے۔ اور جب ان کو اہل دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی، وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان ظالموں کا ساتھی نہ بنائیو!

اور برجیوں والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے، آواز دیں گے۔ کہیں گے کیا کام آئی تمہارے تمہاری جمعیت اور تمہارا وہ سارا گھمنڈ جو تم کرتے تھے! کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے! داخل ہو جنت میں، اب نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۴۶-۴۹

اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے، جو اللہ نے تمہیں بخش رکھی ہیں، کچھ ہم پر بھی کرم فرماؤ۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں — ان کے لئے جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا، پس آج ہم ان کو نظر انداز کریں گے جس طرح انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے

رہے۔ اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علم قطعی کی بنیاد پر کی ہے، ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ یہ لوگ بس اس کی حقیقت کے مشاہدے کے منتظر ہیں۔ جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی، وہ لوگ جنہوں نے اس کو پہلے نظر انداز کیے رکھا، بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے، تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں! انہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گئے!

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ۔ ۴۴

یہ آیت ایک نہایت ہلکا سا تصور دیتی ہے اس انقلاب حال کا جو جنت میں پہنچ کر انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اندر برپا ہو گا۔ اس دنیا میں تو ہمارے سمع و بصر اور ادراک و ابلاغ کی قوتیں نہایت محدود ہیں۔ معمولی معمولی چیزیں ہماری ان قوتوں کی راہ میں روک بنی ہوئی ہیں۔ لیکن عالم آخرت میں یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ جنت کے عالم سے جب چاہیں گے اہل جنت دوزخ والوں کو مخاطب کر کے ان سے سوال و جواب کر لیں گے۔

جنت میں انسانی قوتوں کا عروج

اس سائنسی دور کے انسان کے لیے یہ بات ذرا بھی حیران کرنے والی نہیں ہونی چاہیے۔ جب آج انسان نے قدرت کے محض چند ضمنی قوانین کا راز دریافت کر کے اپنے لیے ایسی دوربینیں ایجاد کر لی ہیں جن کی مدد سے ہزاروں میل کی مسافت پر چلنے والی شمع کی لو دیکھ سکتا ہے، ایسے فون بنا لیے ہیں جن کی وساطت سے جب چاہے پاکستان کا پریسیڈنٹ امریکہ کے پریسیڈنٹ سے بات کر سکتا ہے، ایسے ٹیلی ویژن بنا لیے ہیں جن پر ایک ملک کے لوگ کسی دور دراز ملک کے کسی خطیب کو اپنے ملک کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتے، مجمع کو تالیاں پیٹتے اور نعرے لگاتے

دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ ایسے آلات بنا لیے ہیں جو اس کو لاکھوں میل کی مسافت سے نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ تو آخر اس عالم کی باتوں پر حیران ہونے کی کیا وجہ ہے جہاں یہ سارے نوامیس، جو آج ہمیں جکڑے ہوئے ہیں، بدل جائیں گے اور اس زمین و آسمان کی جگہ نئے آسمان و زمین پیدا ہو جائیں گے۔

اہل دوزخ کی

اہلِ جنت کا یہ سوال اہلِ دوزخ سے جو یہاں نقل ہوا ہے، تبلیغ و تذکیر کے مقصد سے تو ظاہر ہے کہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ اس کا وقت تو گزر چکا ہوگا، اس کا مقصد محض اہلِ دوزخ کی تفضیح ہوگا۔ اس کے جواب میں اہلِ دوزخ کا اعتراف گویا مجرم کا وہ آخری اعتراف ہوگا جس کے بعد اس کے اور اس کی سزا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ ایک منادی ان ظالموں پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا اور یہ اعلان ہم معنی ہوگا اس کے کہ اب سزا اور عذاب کا باب شروع ہو گیا۔

اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ - ۴۵

ایک لطیف تضمین

عام طور پر لوگوں نے اس ٹکڑے کو منادی کے اعلان ہی کا ایک حصہ سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک منادی کا اعلان لفظ 'ظالمین' ہی پر تمام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ٹکڑا بطور تضمین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کے طور پر اس کے ساتھ لگا دیا ہے تاکہ کلام محض مستقبل کی ایک حکایت بن کے نہ رہ جائے بلکہ حال پر بھی پوری طرح منطبق ہو جائے۔ اس تضمین سے گویا یہ وضاحت ہو گئی کہ ظالمین سے مراد کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا کہ وہی لوگ جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں، جو اس میں کجی پیدا کرنے کے لیے ساعی ہیں اور آخرت کے منکر ہیں، اس وضاحت کے بعد آخرت میں ہونے والی منادی وقت کے قریش پر ٹھیک ٹھیک اس طرح چسپاں ہو گئی، گویا

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

اس قسم کی تضمینات قرآن مجید میں بہت ہیں۔ پیچھے بھی ان کی مثالیں گزر چکی ہیں، آگے بھی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس کی ایک مثال آیت ۵۱ میں بھی آ رہی ہے۔ انہی تضمینات سے بالعموم اصولی باتیں یا مستقبل کے ماجرے یا ماضی کی سرگزشتیں حاضر اور حال کا جامہ پہنتی ہیں۔ اس وجہ سے ان پر خاص طور پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے ورنہ نظم کلام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تاویل بے

ایسے تکلف سے کام لینا پڑتا ہے جس سے نہ صرف ذوق ابا کرتا ہے بلکہ زبان کے آداب و قواعد بھی اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ۔ چنانچہ یہاں بھی جن لوگوں نے اس کو تضمین نہیں مانا انہیں 'وھم بالاخرۃ کافرون' کے ٹکڑے کی تاویل میں تکلف کرنا پڑا۔ انہوں نے اس کو 'وھم بالاخرۃ کانوا کافرین' کے معنی میں لیا حالانکہ یہ قرآن میں ایک قسم کا اضافہ ہے ۔

'الذین یصدون' میں 'صد' کا لفظ لازم اور متعدی یعنی رکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آتا ہے ۔ ایسے الفاظ کے ترجمے میں مشکل پیش آتی ہے ۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ کے باب میں محتاط طریقہ یہ ہے کہ اگر قرینہ واضح ہو تب تو قرینہ کے تقاضے کے متعلق ترجمہ کرنا چاہئے ورنہ متعدی مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ اولیٰ ہے اس لیے کہ متعدی کے اندر لازم کا مفہوم خود مضمر ہوتا ہے ۔

'الذین یبغونھا عوجا' میں مراد تو اگرچہ وہ ساری کج رائیاں اور کج عملیاں ہو سکتی ہیں جو خدا کی راہ سے ہٹ کر انسان اختیار کرتا ہے لیکن نظائر قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مفہوم خدا کی صراطِ مستقیم یعنی توحید کی راہ میں کجی پیدا کر کے سڑک کی پگ ڈنڈیاں نکالنا ہے ۔ ان نظائر کی وضاحت کسی مناسب محل میں انشاء اللہ تفصیل سے آئے گی ۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ۝ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ۝ أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۖ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ۔ ۴۶-۴۹

وبینھما حجاب وعلی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیمٰھم۔ 'حجاب' سے مراد، جیسا کہ خود قرآن کے دوسرے مقام سے واضح ہے، وہ دیوار ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کر دی جائے گی ۔ سورۂ حدید میں ہے فَضُرِبَ

حجاب سے مراد جنت اور

بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ - ۱۳ حدید (پس ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی) ایک ایسی دیوار کے طول و عرض کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو پورے عالم جنت اور سارے عالم دوزخ کے درمیان حد فاصل کا کام دے گی جبکہ صرف جنت کی وسعتوں کی تمثیل قرآن میں آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے دی گئی ہے۔

'اعراف' 'عرف' کی جمع ہے۔ 'عرف' گھوڑے کی پیشانی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں یہیں سے یہ لفظ کسی مینارہ یا برجی یا دیدبان کے لئے استعمال ہوا جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پہ بنا دیا جائے، جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا بیک نظر مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوب و بیان سے واضح ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی کی جائے گی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اس دیوار پہ ہوں گے جہاں سے جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ ہو سکے گا۔

'رجال' کا لفظ یوں تو اپنے عام مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے بالعموم نمایاں اور ممتاز اشخاص مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ - ۳۷ نور (ایسے رجال جن کو تجارت اور خرید و فروخت یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی) من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ - ۲۳ - احزاب (اور اہل ایمان میں ایسے رجال ہیں جنہوں نے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو خدا سے انہوں نے باندھا) یہیں آیت ۴۸ میں بھی یہ لفظ ائمہ کفر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ونادٰی اصحاب الاعراف رجالاً یعرفونھم بسیماھم قالوا ما اغنٰی عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون (اور اعراف والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے پکاریں گے، کہیں گے بتاؤ کیا کام آئی تمہاری جمعیت اور کیا کام آیا تمہارا گھمنڈ)

'کُلًّا'۔ لفظ کُل ہم دوسرے مقام میں بتا چکے ہیں کہ جب یہ جماعتوں یا اشخاص کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے معرفہ بن جاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد وہی گروہ یا اشخاص ہوں گے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ یہاں اوپر اہل جنت اور اہل دوزخ کا ذکر ہوا ہے چنانچہ اس سے مراد وہی دونوں گروہ بحیثیت گروہ ہیں۔

'سیما' کے معنی علامت اور نشان کے ہیں مثلاً سیماھم فی وجوھھم من

اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ اپنی نمایاں

اثر السجود - قرآن مجید اور احادیث دونوں میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ قیامت میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں اپنے اپنے اعمال کے اثرات سے ممتاز و ممیّز ہوں گے - مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کی اُمّت میں سے جو لوگ آپ کے بعد آئیں گے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا، اگر ایک شخص کے پنج کلیان گھوڑے دوسرے گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ ان کو پہچان نہ لے گا؟ لوگوں نے کہا، یہ بات تو ٹھیک ہے یا رسول اللہ - آپ نے فرمایا اسی طرح میری امت کے لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے آثار سے اس طرح نمایاں ہوں گے کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے - ابولہب کی بیوی کے متعلق خود قرآن میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں اس طرح کی رسّی پڑی ہوئی ہوگی جس طرح کی رسی ایندھن جمع کرنے والی لونڈیاں اپنے گلے میں ڈال کر لکڑیاں چننے کے لیے نکلا کرتی ہیں -

اس نوع کے بعض اشارات معراج سے متعلق احادیث میں بھی موجود ہیں - غرض یہ بات واضح ہے کہ اہلِ ایمان ہوں یا اہلِ کفر دونوں گروہ اپنے اپنے محل میں اپنی نمایاں نشانیوں اور علامات کے ذریعے سے ممتاز ہوں گے اور اہلِ اعراف ان علامات کے واسطہ سے اہلِ جنت کے صدیقین، شہدا اور صالحین و ابرار کو بھی پہچان لیں گے اور اہلِ دوزخ کے لیڈروں اور اشرار و مفسدین کو بھی -

اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے؟

اجزائے کلام کی تشریح کے بعد قابلِ غور سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے؟ ابن جریرؒ نے اس سوال کے جواب میں چار قول نقل کیے ہیں -

ایک یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں تول میں برابر برابر اتری ہوں گی، اس وجہ سے ان کا فیصلہ ابھی معلق ہوگا کہ دوزخ میں بھیجے جائیں یا جنت میں -

دوسرا یہ کہ یہ علماء اور فقہا کا گروہ ہوگا -

تیسرا یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں حصّہ لیا ہوگا -

چوتھا یہ کہ یہ ملائکہ ہوں گے -

ان میں سے مؤخر الذکر دونوں قول تو بالکل ہی بے جان ہیں - ان کی تائید میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن میں موجود نہیں ہے - اس وجہ سے ان پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں -

پہلا قول اگرچہ بہت مشہور ہے یہاں تک کہ مصرع 'از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است' ہمارے لٹریچر میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر گیا ہے لیکن کئی پہلوؤں سے یہ قول ضعیف معلوم ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ یہاں ان کے لیے 'رجال' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جب اس طرح آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے مراد نمایاں اشخاص در جال ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی نیکیاں اتنی بھی نہ ہوں گی کہ ان کی بدیوں پر بھاری ہو سکیں آخر ان کا ایسا نمایاں وصف کیا ہے جس کے سبب سے ان کا ذکر اس لفظ سے کیا گیا؟

دوسرا یہ کہ جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں برابر برابر ہوں گی ضروری نہیں کہ وہ سب مرد ہی ہوں۔ ان میں عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ان کے لیے رجال کا لفظ کیوں استعمال ہوا، کوئی ایسا لفظ کیوں نہ استعمال ہوا جو جامع نوعیت کا ہوتا۔ مثلاً طائفۃ یا امت یا ان کے ہم معنی کوئی اور لفظ؟

تیسرا یہ کہ یہاں کسی ایک لفظ سے بھی نہ تو یہ بات نکلتی کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ماجرا بیان ہو رہا ہے جس کا معاملہ ابھی معلق ہے اور نہ یہ بات نکلتی کہ اُن کو اعراف کی یہ سیر کرانے سے مقصود کیا ہے حالانکہ موقع ایسا ہے کہ یہ بات واضح ہونی چاہیئے تھی۔

چوتھا یہ کہ یہ لوگ اہل جنت اور اہل دوزخ کو جس انداز میں مخاطب کریں گے، ان کو مخاطب کر کے جو جو باتیں فرمائیں گے اور ان کے ساتھ جس اعزاز و اکرام کا معاملہ مذکور ہوا ہے وہ سب اس امر کے خلاف ہے کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ذکر ہو جس کی اپنی نجات کا معاملہ ابھی معلق اور جس کی اپنی کارگزاری کی نوعیت یہ ہو کہ نیکی اور بدی دونوں برابر ہو کر رہ گئی ہوں۔ قرآن کے بیان سے واضح ہے کہ یہ لوگ اہل جنت کو مبارک باد دیں گے، اہل دوزخ کے لیڈروں کو سرزنش اور ملامت کریں گے کہ تم دنیا میں بہت اترا اترا کے اور اکڑتے رہے ہو، بتاؤ تمہاری جمعیت اور تمہارا سارا سرمایۂ غرور کہاں گیا؟ اُن کو تاڑیں گے کہ تم خدا کی ساری نعمتوں کا اجارہ دار تنہا اپنے کو سمجھتے تھے، غریب مسلمانوں کو کسی فضل کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے، اب دیکھو تم کہاں ہو اور وہ کہاں ہیں؟ آخر میں اہل جنت کو تمکن اور دوام و استمرار کی بشارت دیں گے ــــ غور کیجئے کہ یہ ساری باتیں ایسے لوگوں کی زبان سے کس طرح نکل سکتی ہیں جنہیں خود اپنی نجات کی فکر پڑی ہو کہ معلوم نہیں مشیت غیب کیا فیصلہ کرتی ہے؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ یہ ممکن ہے کہ اس طرح کی باتیں مذبذب و متردد گروہ کے منہ سے نکل

سکیں اور نہ اخلاقی پہلو سے یہ ایسے لوگوں کی زبان سے زیب ہی دیتی ہیں جن کے اپنے کارنامے کچھ زیادہ وقیع نہ ہوں۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ قول اپنی شہرت کے باوجود کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ صحیح قول ہمارے نزدیک دوسرا ہے۔ ابن جریر نے یہ قول مجاہدؒ کی طرف منسوب کیا ہے جن کا مرتبہ تفسیر میں معلوم و معروف ہے۔ مجاہدؒ نے علماء اور صلحاء سے مراد ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو لیا ہے جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں حق کے علمبردار، خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے رہے ہیں جنہوں نے حق کی حمایت میں اہل باطل کے چرکے سہے ہیں اور جو مظلوموں کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ایسے علماء و فقہا یا بالفاظِ دیگر رجال امت بلاشبہ قیامت کے دن اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنت اور دوزخ دونوں کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا آخری انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اپنی زبانوں سے رفقائے حق کو مبارک باد دیں اور دشمنان حق کو سرزنش کریں۔

ونادوا اصحاب الجنۃ ان سلام علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون،

یہ لوگ اعراف کی بلندیوں سے سب سے پہلے اہل جنت کو سلامتی و مبارکی کا پیغام دیں گے۔ "لم یدخلوھا وھم یطمعون" سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کو جنت میں بھیجنے سے پہلے ہی یہ مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی سچائی ہر پہلو سے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جنت میں داخل ہوں۔ "وھم یطمعون" کے الفاظ سے ان کی تواضع جھلکتی ہے۔ باوجودیکہ یہ سارا اعزاز و اکرام صاف شہادت دے رہا ہوگا کہ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے لیکن وہ اپنی تواضع و فروتنی کے سبب سے اپنے آپ کو امید اور رحمت ہی کے درجے میں سمجھیں گے چنانچہ یہاں الفاظ ٹھیک ٹھیک ان کی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ جو لوگ اللہ کی شان جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو امید اور طمع کے درجے سے اونچا کبھی نہیں لے جاتے، یہ تنگ ظرفی کا شیوہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے میں بہک جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر فرماتے ہیں والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی یوم الدین ۸۲۔ شعراء (اور وہ کہ جس سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ جزا و سزا کے دن میری غلطی معاف فرمائے گا) ہمارے حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا، کوئی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا، لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ

آپ بھی؟ ارشاد ہوا، ہاں میں بھی، الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ۔ میں بھی اسی وقت جنت میں جاؤں گا جب اللہ کی رحمت مجھے ڈھانک لے۔

"واذا صرفت ابصارھم تلقاء اصحاب النار الایۃ"۔ یہ اسلوب بیان اکرام اعزاز پہ دلیل ہے۔ پہلے وہ اہل جنت کی کامرانیوں کا مشاہدہ کریں گے اور اس کے مشاہدے میں بالکل محو ہو جائیں گے اس لیے کہ وہاں حال یہ ہوگا کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

پھر اہل دوزخ کی طرف انکو توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر دشمنان حق کے انجام پہ بھی ڈال لیجئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی ان کی زبان سے بے تحاشا تعوذ کی دعا نکلے گی "ربنا لاتجعلنا مع القوم الظالمین" (اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کیجیو) جس طرح اوپر "وھم یطمعون" کے الفاظ سے ان کی تواضع و فروتنی پہ عکس پڑتا ہے اسی طرح یہ دعا ان کے کمال خشیت کی بھی دلیل ہے اور جہنم کے منظر کی ہولناکی کی بھی۔

"ونادی اصحاب الاعراف رجالا یعرفونھم بسیماھم قالوا ما اغنی عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون"۔ اصحاب اعراف کا یہ خطاب الفاظ سے واضح ہے کہ اہل دوزخ کے لیڈروں سے ہوگا اس لیے کہ اپنی جمعیت پر ناز اور اپنے مال وجاہ پر غرہ انہی کو تھا۔ دوزخ میں یہ لوگ اپنے نمایاں نشان سے ممتاز ہوں گے اس وجہ سے اہل اعراف پہچان جائیں گے کہ یہ ابولہب ہے، یہ ابوجہل، یہ فلاں ہے اور یہ فلاں۔ ان کو مخاطب کرکے اہل اعراف ان سے یہ سوال بطور تقبیح کریں گے۔ ہر دور کے ائمہ کفر کا اپنے مال و اسباب اور اپنی تعداد و جمعیت پر غرہ قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے۔ ہم نے یہاں "ما" کو سوالیہ مفہوم میں لیا ہے۔ اس میں زور بھی زیادہ ہے اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پھر بعد کا جملہ جو اسی سے متعلق ہے واضح طور پر سوالیہ ہے بھی اگر اس کو بعد والے جملہ سے الگ دوسرے مفہوم میں لیں گے تو کلام میں ہم آہنگی باقی نہیں رہے گی۔

اصحاب الاعراف کا خطاب کفار کے لیڈروں سے

"اھولاء الذین اقسمتم لاینالھم برحمۃ"۔ یہ سوال ان ائمہ کفر سے، اہل اعراف ساکنین جنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کریں گے کہ بتاؤ کیا یہی وہ لوگ ہیں ہیں

جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی خدا کے کسی فضل کے سزاوار نہیں ہو سکتے ؟ قرآن میں مذکور ہے کہ سادات قریش اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل یہی لاتے تھے کہ اگر اس میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا تو کیا اس کے پیرو یہی فتو فقیر، فاقہ کش اور غلام و نادار بنتے ؟ خدا کی ساری نعمتوں کے سزاوار تو ہم بنائے گئے، پھر اس کے لیے ان کا انتخاب کیوں ہوا ؟ اہل اعراف ان کے اس غرور کو سامنے رکھ کے سوال کریں گے کہ فرماؤ، جن کو تم کسی فضل و رحمت کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے وہ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو ؟

'ادخلوا الجنۃ لاخوف علیکم ولا انتم تحزنون' اوپر والا سوال تو اہلِ اعراف ائمہ کفر کو مخاطب کر کے کریں گے اور یہ بات وہ اہلِ جنت کو مخاطب کر کے ان سے بطور تہنیت و تبریک کہیں گے جس سے برسرِ موقع ان کی توہین کرنے والوں کی تفضیح بھی ہو جائے گی۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اہلِ جنت تو بالفعل جنت میں براجمان ہوں گے ہی پھر ان کو مخاطب کر کے 'ادخلوا الجنۃ' (جنت میں داخل ہو) کہنے کے کیا معنی ؟ غالباً اسی سوال سے بچنے کے لیے ارباب تاویل نے اس جملہ کے مخاطب اور اس کے قائل کے تعین میں بڑے تکلف سے کام لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سارا تکلف انہیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ انہوں نے عربیت کے اس اسلوب کو ملحوظ نہیں رکھا کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنی ہی پر دلیل نہیں ہوا کرتا، بلکہ بعض مواقع میں وہ تمکن واستمرار پر بھی دلیل ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھ لیجیے یہی 'ادخلوا' سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے جو اپنے ابتدائی مفہوم میں نہیں بلکہ تبریک و تہنیت اور تمکن واستمرار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فعل ماضی دوام واستمرار کے مفہوم میں

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ	پس جب وہ یوسف کی خدمت میں
اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ	حاضر ہوئے اس نے اپنے ماں باپ
ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ	کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں
اٰمِنِيْنَ۔ ۹۹۔ یوسف	داخل ہو ان شاء اللہ امن کے ساتھ۔

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت یوسفؑ کے سارے بھائی، ان کی ہدایت کے بموجب، اپنے والدین کو ساتھ لے کر، حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور حضرت یوسفؑ نے مصر میں ان کی پذیرائی فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے مصر میں داخل ہونے کا سوال نہیں تھا۔ وہ مصر میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ ان کے والدین حضرت یوسفؑ کے پہلو میں

فرد کش اور یہ تمام بھائی حضرت یوسفؑ کے پاس موجود تھے۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کا یہ فرمانا کہ 'ادخلوا مصر ان شاء اللہ امنین' صریحاً تبریک و تہنیت اور بشارت تمکن کے مفہوم ہی میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک اسی مفہوم میں اصحاب اعراف کا اہل جنت کو مخاطب کر کے 'ادخلوا الجنۃ لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون' فرمانا بھی ہے۔ یعنی مال و جاہ کے غرور کے متوالے تو تمہیں نہایت حقیر و ذلیل سمجھتے رہے ہیں لیکن اللہ نے ان کے علی الرغم تمہیں جنت کی سرفرازی بخشی، تم اس میں سرفراز رہو، اب نہ تمہارے لئے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰

'حرمہما' میں جس تحریم کا ذکر ہے یہ شرعی حرمت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس معنی میں ہے جس معنی میں فانہا محرمۃ علیہم اربعین سنۃ ۲۶- مائدہ (پس یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی) میں ہے۔ یعنی چالیس سال کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو حتمی طور پر اس سرزمین سے محروم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو کسی چیز سے حتمی طور پر محروم کر دے تو نہ وہ چیز کسی طرح اس کو پہنچ سکتی اور نہ وہ اس کو کسی طرح پا سکتا۔ اہل جنت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سوال کے پورے کرنے میں تو کوئی عذر نہیں ہے، ان کے پاس ہر نعمت کی فراوانی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے اہل دوزخ کو محروم کر دیا ہے اس وجہ سے نہ یہ ان کو پہنچ سکتی ہیں نہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَاۗءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۵۱

یہ آیت بطور تضمین ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے جواب 'حرمہما علی الکافرین' کی وضاحت اپنی طرف سے فرما دی کہ 'کافرین' سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس تضمین سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا۔ گویا قریش پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صرف دوسروں کی حکایت ہے بلکہ یہ ان کی بھی حکایت ہے۔ اس قسم کی تضمین کی مثال اوپر آیت ۴۵ میں بھی گزر چکی ہے۔

'الذین اتخذوا دینهم لهوا ولعبا' یعنی اللہ نے جو چیز ان پر دین کی حیثیت سے اتاری اس کو انہوں نے ہنسی مسخری میں اڑا دیا۔ ہر چیز کا ایک محل و مقام ہوتا ہے۔ دین اس لئے آتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطۂ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے بجائے فلاح و سعادت کی راہ اختیار کریں لیکن جن لوگوں نے زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ایسے اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ یا ان کے خلاف سنجیدہ سے سنجیدہ حقیقت کو بھی مذاق تصور کرتے اور مذاق ہی میں اس کو اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بازی بازی باریش بابا ہم بازی!!

'غرتهم الحیوة الدنیا' یہ اس لاابالیانہ طرز عمل کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ وہ کیوں زندگی کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے اندھے بنے رہے۔ فرمایا کہ دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں، دندنا رہے ہیں اور کوئی باز پرس ان سے نہیں ہو رہی ہے۔ اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس دنیا اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر کسی اللہ کے بندے نے ان کو توجہ دلائی کہ اس کے بعد ایک روز حساب کتاب بھی آنے والا ہے تو اس کے لتے لے ڈالے کہ یہ دیوانہ اور خبطی ہے۔ ہماری آزادی اور ہمارے عیش کو مکدر کر رہا ہے۔

'فالیوم ننسٰهم کما نسوا لقاء یومهم هذا'۔ یہاں 'ننسٰهم' نظر انداز کر دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ فعل کا استعمال اس اسلوب پر ہے جس کو دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ استعمال بظاہر فعل ہوتا ہے لیکن مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھولتا نہیں۔ یہ بھولنا نظر انداز کرنے کی تعبیر ہے۔

'لقاء' قرآن کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوا ہے کہیں اپنے ظرف کی طرف لیکن مدعا دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ یعنی رب سے ملاقات آخرت میں۔ 'انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا' یعنی 'اس دن میں اپنے رب کی ملاقات کو بھلائے رکھا'۔

'وما کانوا بآیاتنا یجحدون' یہ جملہ چونکہ اوپر والے جملے ہی پر عطف ہے اس وجہ سے یہ دراصل 'کما کانوا' کے مفہوم میں ہے۔ 'کما' کے اندر تشبیہ و تمثیل کے ساتھ ساتھ سببیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ 'اور بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے'، تو یہ ترجمہ بالکل صحیح ہوگا۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ
تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاۗءَتْ رُسُلُ
رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَاۗءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ
فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ
ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۔ ۵۲-۵۳

وَلَقَدْ جئناھم بکتٰب فصلنہ علی علم۔ ’ھم‘ کا مرجع قریش ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار فرمایا ہے جو قرآن کی صورت میں ان پر فرمایا۔ اس کتاب کی صفت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں ہم نے اپنے علم قطعی کی روشنی میں ان تمام امور کی تفصیل بیان کردی ہے جن سے آگاہ ہونا دنیا و آخرت کی سعادت کے لئے ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ان تفصیلات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اوپر اہل جنت، اہل دوزخ اور اصحاب الاعراف سے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ جو ہیں اگرچہ عالم آخرت سے متعلق لیکن کوئی ان کو محض ہوائی اور خیالی باتیں (FICTION) نہ سمجھے بلکہ یہ پیش آنے والے حقائق ہیں جو تمام تر ’علی علم‘ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں لفظ ’علم‘ کی تنکیر موقع کلام دلیل ہے کہ تفخیم شان کے لیے ہے، یعنی یہ خدا کے عظیم، وسیع محیط کل علم پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر بات قطعی اور اٹل ہے۔ خدا قیامت کے روز کی باتیں بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح کل اور آج کی باتیں جانتا ہے اس وجہ سے اگر کسی نے ان کو خیالی باتیں قرار دے کر ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو وہ سوچ لے کہ وہ دن دور نہیں جب وہ ایک ایک بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور پکار اٹھے گا کہ اللہ کے رسول نے جن جن باتوں کی خبر دی تھی سب سچی ثابت ہوئیں۔

’ھدی ورحمۃ لقوم یومنون‘ ہدایت و رحمت کے دو لفظوں نے آغاز و انجام اور دنیا و آخرت دونوں کو سمیٹ لیا ہے۔ یعنی یہ کتاب لوگوں کے لیے دنیا میں ہدایت ہے اور اس ہدایت کو اختیار کرنے کا ثمرہ آخرت میں رحمت ہے۔ ’یومنون‘ فعل، جیسا کہ ہم دوسرے محل میں واضح کرچکے ہیں، ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ اس کا ترجمہ یوں کیجئے ’اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں‘۔

’ھل ینظرون الا تاویلہ‘۔ ’تاویل‘ کے لفظ پر ہم سورہ آل عمران کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کرچکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں جو قرآن سنا رہا ہے ہیں تو اٹل حقیقتیں لیکن چونکہ ابھی

یہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی ہیں بلکہ مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں اس وجہ سے یہ ان کو خالی خولی دھمکی سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہ واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں تو ان کو دیکھ کر یقین کریں گے۔

'یوم یاتی تاویلہ یقول الذین نسوہ من قبل قد جاءت رسل ربنا بالحق'؛ مطلب یہ ہے کہ جب یہ باتیں واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں گی تو آج جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ پکار اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے جن باتوں سے ہمیں آگاہ کیا تھا وہ سب حقیقت ثابت ہوئیں۔ اس وقت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ ہے کوئی سفارشی جو ہماری سفارش کرے یا ہے کوئی صورت کہ ہم دنیا میں پھر جائیں اور کچھ نیکی کمائیں!۔ لیکن ان کی یہ حسرت حسرت ہی رہے گی اس لیے کہ نیکی کی کمائی کا وقت نکل چکا ہوگا۔ جو وقت ان کو نیکی کمانے کے لیے ملا اس میں انہوں نے بدی کمائی اور جھوٹے سفارشیوں پر تکیہ کیے رہے۔ 'قد خسروا انفسھم و ضل عنھم ما کانوا یفترون'۔ زندگی کی اصل قیمت، جیسا کہ سورہ والعصر میں واضح فرمایا ہے، یہی ہے کہ اس میں نیکی کمائی جائے جس نے نیکی نہ کمائی اس کی زندگی وبال بنی اور اس نے بڑے قیمتی سرمایہ سے اپنے لیے تباہی کا سودا کیا۔ 'ضل عنھم' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے فرضی معبود سب خواب و خیال ثابت ہوں گے اس لئے کہ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ تھی ہی نہیں کہ انہوں نے اپنے جی سے گھڑ کے ان کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا کہ خدا نے ان کو اپنا شریک و شفیع بنایا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۴-۵۸

اوپر بات شرک کی بے حقیقتی و بد انجامی پر ختم ہوئی تھی۔ آگے کی آیات میں توحید کے مضمون کی وضاحت فرما کر اس کی تکمیل کر دی کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور وہ اس کائنات کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اپنے عرش حکومت پر متمکن ہو کر تمام کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ دن اور رات، سورج اور چاند، ستارے اور سیارے سب اسی کے احکام کی تعمیل میں شب و روز گردش میں ہیں جس نے خلق کیا ہے اسی کا امر و حکم تمام کائنات پر جاری ہے اور خالق کائنات کے سوا دوسرا کوئی حق دار کس طرح ہو سکتا ہے۔

کہ خدا کی خلق کی ہوئی کائنات میں اس کا حکم چلے؟ پھر یہ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اس کو خلق کرنے والی ہستی بڑی ہی بافیض اور نہایت ہی بابرکت و رحمت ہستی ہے تو سراً و علانیۃً اسی کو پکارو اور امید و بیم ہر حال میں اسی سے لو لگاؤ۔ خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک گردانا خدا سے بغاوت اور اس کی زمین میں فساد برپا کرنا ہے اور خدا ان لوگوں کو کبھی نہیں پسند کرتا جو اس سے سرتابی کریں اور اس کی زمین میں فساد مچائیں۔

اس کے بعد بارش کی ایک تمثیل پیش کی ہے۔ جس سے بیک وقت تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا کی رحمت اس کے نیکوکار بندوں سے بہت قریب ہے اس وجہ سے امید و بیم ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، خدا اور اس کی رحمت کو دور سمجھ کر دوسروں کا سہارا نہیں پکڑنا چاہیئے۔ یہ خدا ہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے اور تمہارے مایوس ہو جانے کے بعد اپنی رحمت کی گھٹائیں اٹھاتا اور تمام زمین کو جل تھل کر دیتا ہے۔

دوسری یہ کہ جس طرح تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالے جب چاہے گا تمہارے مر کھپ جانے کے بعد تمہیں ازسرنو زندہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

تیسری یہ کہ جس طرح بارش کا اثر مختلف صلاحیت کی زمینوں پر مختلف شکل میں نمایاں ہوتا ہے، زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے، بنجر زمین صرف خار و خس اگاتی ہے اسی طرح قرآن کی شکل میں ہدایت و رحمت کی جو بارش اس زمین پر نازل ہوئی ہے اس سے بھی مختلف صلاحیت کی طبیعتیں مختلف اثر لیں گی۔ جنہوں نے اپنی فطرت کو مسخ ہونے سے بچایا ہے وہ اس سے فیض پائیں گے اور ان کے دل نور ایمان سے جگمگا اٹھیں گے۔ لیکن جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ان کے اندر صرف کفر و عناد کی جھاڑیاں اگیں گی۔ آیات کی تلاوت فرمایئے :-

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَّالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ
اللَّهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ۵۴ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۗ إِنَّهُ لَا
يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۵۵ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ

خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۶ وَهُوَ الَّذِيْ
يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا
ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۵۷
وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ
لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝۵۸

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ ڈھانکتا ہے رات کو دن پر جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کئے جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لئے خاص ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، عالم کا رب! اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے۔ اور چپکے چپکے، بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو اور اسی کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں۔ بیشک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔ ۵۴-۵۶

اور وہی ہے جو اپنے ابر رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب و گیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مُردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔ اور زرخیز زمین کی پیداوار خوب اچھتی ہے اس کے رب کے حکم سے پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اس طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار بننا چاہیں۔ ۵۷-۵۸

۹- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ
اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ

حَثِيْثًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ
اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ - ۵۴

خالقِ حقیقی ہی رب ہے

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اہل عرب آسمان و زمین اور تمام دوسری چیزوں کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انہوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا رکھے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا خلق کر کے اس کے انتظام و انصرام کے مختلف شعبے اپنے دوسرے کارندوں میں تقسیم کر دیئے ہیں اور اب ان شعبوں کے اصلی کرتا دھرتا وہی ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت ضروری ہے۔ وہی خدا کے قرب کا واسطہ ہیں اور رزق و فضل اور مال و اولاد کے خزانوں پر عملاً انہی کا تصرف ہے۔ اگر ان کو نہ راضی رکھا جائے تو اکیلے اللہ تعالیٰ سے کام نہیں چل سکتا۔ انہی کارندوں کو وہ ارباب، شرکاء اور شفعاء کا درجہ دیتے تھے اور گو نظری طور پر ان کی فہرست میں خدا کو خالق کائنات۔ اور رب الارباب کی حیثیت حاصل تھی لیکن عملاً ان کی ساری وابستگی رب الارباب سے نہیں بلکہ ان فرضی ارباب ہی سے رہ گئی تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی گمراہی پر ٹوکا ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، وہی رب بھی ہے، جب خالق وہ ہے اور اس سے تمہیں انکار نہیں تو دوسروں کو رب کس منطق سے بنائے بیٹھے ہو؟

[illegible]

فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ میں ایام سے مراد یہ ہمارے چوبیس گھنٹے والے دن نہیں ہیں بلکہ اس سے خدائی دن مراد ہیں۔ خدا کی سکیمیں اس کے اپنے دنوں کے حساب سے بروئے کار آتی ہیں جو ہمارے حساب سے جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہیں۔ دنیا کا چھ ادوار میں پیدا ہونا تورات میں بھی مذکور ہے اور قرآن میں بھی اور جہاں تک اس کے تدریجی ارتقاء کا تعلق ہے فلسفۂ جدید بھی بڑے شد و مد سے اس کا مدعی ہے۔ اس وجہ سے بجائے خود اس کائنات کا ارتقاء قدیم و جدید میں متنازع فیہ نہیں ہے البتہ نظریۂ ارتقاء کی تقریر اس کے علمبرداروں کی طرف سے جس انداز میں کی جاتی ہے اس میں بہت سے منطقی خلا ہیں جو اس وقت تک نہیں بھر سکتے جب تک ان عقلی و فطری اصولوں کو تسلیم نہ کیا جائے جو قرآن نے اس ارتقاء کے بیان فرمائے ہیں۔ ہم ان شاء اللہ اس کے محل میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔

اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو چھ دنوں، یا چھ ادوار میں پیدا کرنے کے بجائے اپنے ایک

کلمہ کن سے آن کی آن میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کی قدرت سے بعید نہیں تھی۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ چھ ادوار میں پیدا ہو۔ خدا نے اپنے خلق و تدبیر کے ہر شعبے میں جس طرح اپنی قدرت نمایاں فرمائی ہے اسی طرح اپنی حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں فرمائی ہیں اور اس کی ان شانوں کا نمایاں ہونا بھی انسان کے کمال عقلی و روحانی کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کے کمال قدرت کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ ہم نے سورۂ انعام کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی کہ ہماری غذا کے لیے براہ راست آسمان سے روٹی برستی پھر یہ کیوں ضروری ہوا کہ ہوائیں چلیں، بادل اٹھیں، مینہ برسے، کھیتوں میں ہل چلیں، گندم بوئی جائے، انکھوے نکلیں، ڈنٹھل پیدا ہوں، اس میں برگ و بار نمایاں ہوں، فصل اپجے، خوشے نمودار ہوں، پھر ان میں دانے بیٹھیں، پھر گرم و خشک ہوائیں چلیں جو ان دانوں کو پکائیں اور اس طرح کہیں چھ مہینے کے گرم و سرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانا کھیت سے کسان کے کھتے تک پہنچے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس طرح اس کائنات کی ایک ایک چیز خدا کی آیات خلق و تدبیر اور اس کے عجائب قدرت و حکمت کا ایک دفتر بن گئی ہے۔ انسان اس کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالتا ہے آنکھیں کھلی ہوں اور عقل بیدار ہو تو معرفت الٰہی کا ایک دبستان کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے نہ جانے کتنے بھیس بدلتی اور کتنے جامے تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے اور ہم ان کے اندر خدا کی نشانیوں کو دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں جو حال اس دنیا کے ذرّے ذرّے کا ہے وہی حال بحیثیت مجموعی اس دنیا کا ہے۔ یہ بھی ایک حادثہ کے طور پر یک بیک بن کر نہیں کھڑی ہو گئی ہے بلکہ اس کی تعمیر کرنے والے نے بڑی تدریج و حکمت اور بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف مراحل میں اس کو تکمیل تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ وہ انسان کے فروکش ہونے کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ ہو گئی۔ یہ اہتمام و تدریج شاہد ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد کارخانہ ہے اور ضرور ہے کہ ایک دن وہ غایت و مقصد ظہور میں آئے۔ اس نقطہ پر مفصل بحث ہم سورۂ ہود کی آیت ۷ کے تحت کریں گے جہاں اسی اہتمام کے پہلو سے جزا و سزا پر استدلال کیا ہے۔

ثم استوی علی العرش، یہ اس شان و اہتمام کے ساتھ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کا ایک بدیہی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جس نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا سنوارا اس کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھے۔ اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تخت حکومت پر متمکن

ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرمائے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بعض جگہ 'استوی علی العرش' کے ساتھ 'یدبر الامر' بھی آیا ہے۔ خدا خلق تو کرے لیکن پھر اس کا انتظام نہ کرے یہ خدا پر نہایت ہی سفیہانہ تہمت ہے۔ ایک بادشاہ اگر بڑے اہتمام سے ملک حاصل کرے لیکن ملک حاصل کر کے کسی گوشے میں جا بیٹھے، اس میں امن و عدل کا اہتمام نہ کرے، مفسدین اس میں دھاندلی مچاتے پھریں تو ساری خلق اس کو نالائق بادشاہ کہے گی، پھر ایک معمولی بادشاہ کے لیے جو بات عیب میں داخل ہے آسمان و زمین کے خالق و مالک کے لیے وہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے؟ یہ مشرکین کے اس مزعومہ کی تردید ہے کہ خدا خالق تو ہے لیکن آسمان و زمین کو خلق کر کے اس نے عالم کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے شرکاء کے حوالہ کر دیا ہے اور خود الگ تھلگ جا بیٹھا ہے ساتھ ہی یہ ان کم سواد فلسفیوں کی بھی تردید ہے جو خدا کو صرف ایک گوشہ نشین علۃ العلل کا درجہ دیتے ہیں جس نے محرک اول کی حیثیت سے ایک حرکت تو پیدا کر دی لیکن پھر اس کو اس سے کچھ بحث نہیں رہی کہ اس کی اس حرکت کے کیا نتائج نکلتے ہیں اور اس کو کنٹرول کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ فرمایا کہ خدا کائنات کو پیدا کر کے عرش پر متمکن ہے اور کائنات کا انتظام فرما رہا ہے۔ عرش اقتدار کی تعبیر ہے اور 'استوی' کے بعد جب 'علی' آتا ہے تو اس کے معنی تمکن کے ہو جاتے ہیں۔

'یغشی اللیل النہار یطلبہ حثیثا' 'حثیث' اور 'حثوث' کے معنی تیز اور سرگرم کے ہیں۔ یہ اس تدبیر و انتظام کی وضاحت ہو رہی ہے جو 'استوی علی العرش' کے اندر مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نظام کائنات میں جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اس کے خالق ہی کے تدبیر و انتظام سے ہو رہی ہے۔ وہی ہے جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور اسی کے حکم سے اس سرگرمی سے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ 'والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ' وہی ہے جس نے سورج اور چاند اور دوسرے تمام نجوم و کواکب پیدا کئے۔ 'مسخرات بامرہ' یعنی وہ اپنے اپنے معینہ فرائض اور اپنے اپنے معینہ حدود و قیود کے خدا کے حکم سے پابند ہیں اور پوری سرگرمی کے ساتھ شب و روز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ایک پل کے لیے بھی غافل ہوں یا بال برابر بھی اپنے حدود سے متجاوز۔

'الا لہ الخلق والامر' بیان واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی۔ یعنی جس نے یہ کائنات خلق کی ہے اسی کا امر و حکم اس کے گوشہ گوشہ میں جاری ہے۔ ذرہ ذرہ شب و روز اسی کے احکام

کی تعمیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہے اور یہی حق بھی ہے کہ اس کا امر و حکم اس کے ہر گوشے میں چلے اس لیے کہ جس نے خلق کیا ہے اس کے سوا کسی اور کا حکم اس میں چل کس استحقاق کی بنا پر سکتا ہے!

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ لفظ 'حثیث' سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ ہر چیز پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دے رہی ہے، کسی چیز سے بھی نیم دلی یا سرد مہری کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کے لیے بھی خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے یہی رویہ زیبا ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت میں اسی طرح سرگرم ہو۔ دوسری بات یہ قابل لحاظ ہے کہ یہاں رات کی سرگرمی کا ذکر تو فرمایا لیکن دن کی سرگرمی کا ذکر نہیں فرمایا درآنحالیکہ دوسرے مقام میں رات کے ساتھ دن کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ مثلاً و هو الذی جعل اللیل والنهار خلفة لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا۔ ۶۲۔ الفرقان۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں رات کے ذکر کے بعد سورج کا ذکر آ گیا ہے جس سے مقابل پہلو خود بخود واضح ہو گیا۔

'تبارک اللہ رب العالمین'۔ 'تفاعل' میں غایت درجہ مبالغہ کا مضمون پایا جاتا ہے اس وجہ سے 'تبارک اللہ' کے معنی ہوں گے 'بڑی ہی برکت و رحمت والی ہستی ہے اللہ' اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے خلق و تدبیر کی جو شانیں واضح فرمائی ہیں ان سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جس طرح خدا کی قدرت و عظمت کا اظہار ہو رہا ہے اسی طرح اس کی رحمت و ربوبیت، اس کے جود و نوال اور اس کی کرم نوازی و فیض بخشی کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یہ خدا کے باب میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ انہوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اس قدر بڑھایا کہ اس کی صفات رحمت و برکت کا تصور اس کے نیچے بالکل دب کے رہ گیا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسایط کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ صفات الٰہی کے باب میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اس وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ قرآن نے یہاں 'تبارک اللہ رب العالمین' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے

اسی طرح اس کی بے پایاں برکت و رحمت پر بھی گواہ ہے تو اس سے مانگنے کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ خوف اور طمع، امید اور بیم ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی سے مانگو، جس طرح وہ اپنے جلال میں یکتا ہے، اسی طرح اپنی رحمت میں بھی یکتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○
وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ
طَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ - ۵۵-۵۶

دعا کے آداب

'ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ'۔ 'تضرع' 'ضراعۃ' سے ہے۔ اس کے معنی عاجزی، خوشامد، لجاجت اور تملق کے اظہار کے ہیں۔ یہ اظہار حرکات اور اداؤں سے بھی ہوتا ہے اور الفاظ و عبارات سے بھی۔ اس کی سب سے زیادہ مؤثر شکل وہ ہوتی ہے جب یہ الفاظ و حرکات دونوں میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ نمایاں ہو جس کی بہترین شکل اسلام میں نماز ہے۔ باوضو ہو کر مؤدب کھڑے ہونا، ہاتھ باندھ لینا، سر جھکا دینا، گھٹنے ٹیک دینا، ناک اور پیشانی خاک پر رکھ دینا، یہ تضرع کی حرکات اور ادائیں ہیں اور ان مختلف حرکات اور اداؤں کے ساتھ جو دعائیں اور تسبیحات پڑھی جاتی ہیں یہ سب اس تضرع کی معنوی تعبیریں ہیں۔

'خفیۃ' کے معنی 'چپکے چپکے' کے ہیں۔ یہ تضرع کے آداب میں سے ہے جو تضرع کے اخلاص کا بھی ضامن ہے اور اس کے وقار کا بھی۔ جو کام چپکے چپکے کیا جاتا ہے وہ ریا کے فتنہ سے محفوظ ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے اس وجہ سے اس کو سنانے اور اس سے فریاد کرنے کے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'خفیۃ' کا لفظ صرف ریا اور سوءِ ادب کے سدباب کے لیے ہے۔ اس سے اس جہر کی نفی نہیں ہوتی جو جماعتی دعاؤں یا بعض اوقات بندہ اپنی انفرادی مناجاتوں میں اختیار کرتا ہے۔ یہ جہر کی نفی نہیں بلکہ صرف اعتدال کی تائید ہے۔ اس مضمون کی وضاحت انشاء اللہ بنی اسرائیل کی آیت ولا تجھر بصلوتک ولا تخافت بھا وابتغ بین ذالک سبیلا ۱۱۰ کے تحت آئے گی۔

الفاظ کی وضاحت کے بعد اب آیت کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ اوپر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے، اسی کے حکم سے ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں، خلق اور امر سب اسی کے اختیار میں ہے اور وہ بڑی ہی بافیض و بابرکت ہستی ہے۔ اب یہ 'ادعوا ربکم' سے وہ حق اور فرض بیان ہو رہا ہے جو اس رب عظیم و کریم کا بندوں

پر عاید ہوتا ہے۔ وہ حق و فرض یہ ہے کہ اپنے اسی رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے یعنی یہ استکبار اور یہ رعونت جس کا اظہار تمہاری طرف سے ہو رہا ہے یہ روش تمہارے لیے زیبا نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سرنگندہ و سرنگوں اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم لگا ہوا ہے تو تمہاری کیا ہستی ہے کہ خدا کے آگے اکڑو اور سر اٹھاؤ۔ 'انہ لا یحب المعتدین'۔ خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس کے حدود سے تجاوز کریں۔ یہ نظام کائنات شاہد ہے کہ وہ کسی چیز کو اس کے حدود سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا اور اس دنیا کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ اس نے کبھی اکڑنے والوں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں کو ایک حد خاص سے زیادہ مہلت نہیں دی۔

'ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا' یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید و توثیق منفی پہلو سے ہے۔ یعنی اپنے رب سے انحراف اختیار کر کے اس زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ قرآن میں مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے، یہ تو قائم ہی اس بنا پر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرۂ اختیار میں بھی صرف اسی اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت و اطاعت کریں، کسی اور کو اس عبادت و اطاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظام عدل و شریعت درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام و بقا کے لیے جس طرح تکوینی توحید ناگزیر ہے اسی طرح اس زمین کے امن و عدل کے لیے خدا کی تشریعی توحید بھی لازمی ہے۔ خدا کے ملک میں کسی اور کو الٰہ و معبود بنانا اس کے ملک میں فساد و بغاوت برپا کرنا ہے جس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں۔

'لا تفسدوا' کے ساتھ 'بعد اصلاحھا' کی قید اس فعل کی شناعت کے اظہار کے لیے ہے۔ یعنی ملک میں فساد پیدا کرنا بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب کہ اصلاح کے بعد واقع ہو اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خالق کائنات نے جب اس دنیا کو بنایا تو اس کو بنا کر یونہی انتشار اور بدامنی کے حال میں چھوڑ نہیں دیا بلکہ آدمؑ اور ان کی ذریت کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی ان سے توحید یعنی اپنی ہی عبادت اور اپنی ہی اطاعت کا اقرار لیا۔ اس کا ذکر اسی سورہ کی آیات ۱۷۲ - ۱۷۳ میں آگے آ رہا ہے۔ پھر ذریت آدمؑ سے، جیسا کہ آیت ۳۵ - ۳۶ میں گزرا، یہ وعدہ

فرمایا کہ تمہاری ہدایت کے لیے میں اپنے رسول بھیجوں گا، تم ان کی پیروی کرنا، جو ان کی پیروی کریں گے فلاح پائیں گے، جو تکبر کرکے ان سے اعراض کریں گے وہ ہلاک ہوں گے۔ پھر اپنے اس وعدے کے بموجب اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے جن کی تفصیل آگے آیت ۵۹ سے آیت ۹۳ تک آرہی ہے۔ ان رسولوں کی سرگزشت میں، جیسا کہ آیات ۶۹، ۷۴، ۸۵، ۱۰۰، ۱۰۲ سے واضح ہوگا، یہ دکھایا ہے کہ اولاد آدمؑ کے مختلف گروہوں نے جب جب اللہ کی صراط مستقیم سے ہٹ کر اس دنیا میں فساد برپا کیا ہے خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کو انذار کیا ہے۔ اور جب انہوں نے اس انذار کی پروا نہیں کی ہے تو خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی ہے اور ان کی خلافت دوسروں کو سونپی ہے کہ دیکھے وہ اس خلافت کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ دنیا بار بار شیطان اور اس کی ذریات کی کوششوں سے بگڑی ہے اور بار بار انبیاء و مصلحین کے ذریعہ سے اس کی اصلاح ہوئی ہے۔ اس پہلو سے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں جس قوم کو بھی اپنے پچھلوں کی خلافت ملی ہے ایک فساد کو مٹا کر اس کی اصلاح کی شکل میں ملی ہے اور اگر خلافت پانے والی قوم نے خلافت پاکر اس میں فساد برپا کیا ہے تو یہ اس نے ایک بگڑی ہوئی چیز کو نہیں بگاڑا ہے بلکہ ایک بنی ہوئی چیز کو بگاڑا ہے اور یہ چیز اس کے جرم کو سنگین سے سنگین تر بنا دیتی ہے۔

اجتماعی مصلحین کا ایک مغالطہ

جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے ان کے اور ان کی امتوں کے باب میں مذکورہ بالا اصول بالکل اٹل ہے۔ ان کے ذریعہ سے حق سورج کی طرح چمکتا ہوا نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے ہاتھوں جو نظام مٹتا ہے وہ باطل ہوتا ہے، جو قائم ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آج قوموں کے عروج و زوال کے معاملہ میں قدرت کا قانون بدل گیا۔ آج بھی اگر کوئی قوم مٹتی ہے تو اتفاق سے نہیں مٹتی اور اگر کوئی قوم عروج پر آتی ہے تو اتفاق سے نہیں آجاتی بلکہ ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج میں اصلاً اخلاقی عوامل ہی کام کرتے ہیں۔ لیکن کسی قوم کا چند زندگی بخش عوامل اخلاقی کے سہارے عروج پر آجانا ایک اور بات ہے اور کسی نظام کا حق ہونا ایک دوسری چیز۔ کسی قوم کا عروج اس بات کی دلیل تو ضرور ہے کہ اس کے اندر مغلوب و مفتوح قوم کے مقابل میں زندگی بخش عوامل اخلاق زیادہ ہیں لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہ قوم اور اس کا نظام سو فی صدی حق ہے۔ ہمارے بہت سے اجتماعی مصلحین کو یہ اصول سمجھنے میں

سخت مغالطہ پیش آیا ہے جس کے سبب سے وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ جو لوگ قومی تعصب میں مبتلا رہے انہوں نے ہمیشہ غالب قوم کے غلبہ کو اس کی چیرہ دستی اور کیادی پر محمول کیا، وہ اپنے تعصب کے سبب سے نہ تو اس اخلاقی برتری کو دیکھ سکے جو غالب قوم کے اندر موجود تھی اور نہ اس اخلاقی ضعف پر ان کی نظر پڑی جو ان کے اپنے اندر پایا جاتا تھا۔ اسی طرح جو لوگ مرعوب ذہن کے تھے انہوں نے ہر غالب کے غلبہ کو اس کے برحق ہونے کی دلیل سمجھا اور اس کے ہاتھوں جو فساد و باطل بھی دنیا میں برپا ہو گیا اسی کو نظام حق سمجھ کر اس کے گن گانے لگے۔ اس افراط و تفریط کا اثر قوموں کی تاریخ پر یہ پڑا کہ وہ بالکل غلط طریقہ پر مرتب ہو گئی جس سے صحیح نتائج نکالنا اور ان سے اجتماعی اصلاح میں فائدہ اٹھانا ناممکن ہو گیا۔ یہاں ہم اس اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ انشاءاللہ سورۂ روم کی تفسیر میں ہم اس پر شرح و بسط سے بحث کریں گے۔

'وادعوہ خوفا وطمعا ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین'۔

یہ 'وادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ' کا مقابل جملہ ہے۔ اس میں خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی تھی جو استکبار کی ضد ہے۔ اب یہ خدا کے پکارنے کے محرک کی وضاحت فرمائی جس سے شرک کے ہر شجر ثومہ کی جڑ کٹ گئی ہے۔ استکبار خدا سے بے پروا کرتا ہے۔ اگر اس کا سر کچل دیا جائے تو انسان کے اندر فقر پیدا ہوتا ہے اور یہ فقر بندے کو خدا سے جوڑتا ہے۔ اس فقر کے دو پہلو ہیں۔ ایک خوف، دوسرا طمع، اپنے لفظوں میں ان کو امید و بیم سے تعبیر کر لیجیے۔ انسان کے اندرونی داعیات بھی انہی دو قسموں میں منقسم ہیں اور اس کے خارجی عوامل و محرکات کا بھی تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی یا تو بیم کے تحت آتے ہیں یا امید کے تحت۔ ہم بہت سی چیزیں، مادی اور معنوی دونوں ہی قسم کی، چاہتے ہیں، ان کے ارمان رکھتے ہیں، ان کے آرزو مند ہیں، اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں، مادی اور معنوی دونوں قسم کی، جن سے گریز کرنا چاہتے ہیں، جن سے اندیشہ رکھتے ہیں، جن کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن ان دونوں ہی راستوں کے لیے توحید کا تقاضا یہ بتاتا ہے کہ انسان صرف اللہ ہی کو اپنا مرجع و مولیٰ بنائے۔ جو کچھ چاہے اس کے لیے بھی خدا ہی سے رجوع کرے، جس سے اندیشہ محسوس کرے اس سے بچنے کے لیے بھی خدا ہی کی پناہ ڈھونڈے، اس لیے کہ دینے والا بھی وہی ہے، روکنے والا بھی وہی ہے، اس کے سوا نہ کوئی کسی خیر سے بہرہ مند کر سکتا، نہ کسی

شر سے بچا سکتا ہے۔ نیز خیر و شر کی معرفت کا حقیقی معیار بھی وہی ہے، امید و بیم دونوں میں اگر خدا ہی مرجع ہو اور اسی کی مرضی مطلوب ہو تو انسان کو یہ معین کرنے میں ذرا زحمت پیش نہیں آ سکتی کہ کیا چیز چاہنے کی ہے اور اسے کس طرح چاہنا چاہیئے اور کیا چیز بچنے کی ہے اور اس سے کس طرح بچنا چاہیئے ——— یہ امر ملحوظ رہے کہ خوف اور طمع یہ دونوں ہی گھاٹیاں بڑی خطرناک ہیں، شیطان ان دونوں ہی سے انسان پہ شب خون مارتا ہے اور کسی نہ کسی شرک جلی یا خفی میں لوگوں کو مبتلا کرکے رہتا ہے۔

'إن رحمة الله قريب من المحسنين' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنی امید و بیم دونوں کا مرجع اپنے رب کو بنا لیں وہ درحقیقت محسن یعنی خوب کار ہیں اور اللہ کی رحمت ایسے خوب کاروں سے بہت قریب ہے۔ معلوم ہوا کہ مقام احسان پہ فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم و رجا دونوں حالتوں میں اپنے رب کی طرف یکسو ہو۔ اگر یہ یکسوئی حاصل نہ ہو تو وہ مقام احسان سے دور ہے اور جو مقام احسان سے دور ہے وہ خدا کی رحمت سے بھی دور ہے۔ خدا کی رحمت قریب محسنین سے ہے۔ وہ جب کسی امید یا بیم میں اس کو پکارتے ہیں وہ اپنی رحمت سے ان کو بہرہ مند فرماتا ہے۔ یہاں زبان کا یہ قاعدہ ملحوظ ہے کہ لفظ رحمت کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے خبر کو مونث لانا ضروری نہیں ہوا۔ نیز فعیل کا وزن بعض حالات میں مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں آتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ
حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ
فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ
كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ وَالْبَلَدُ
الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ
لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ
يَشْكُرُونَ ۔ ۵۷ - ۵۸

'وهو الذي يرسل الرياح بشرا بين يدي رحمته' رحمت سے مراد یہاں بارش ہے۔ قرآن میں بارش کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال ہوا

ہے ۔ یہ تمثیل ہے اس بات کی کہ خوف وطمع دونوں ہی حالتوں میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اس لیے کہ یہ رحمت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتی ہے ۔ بارش، جس پر تمام دنیا کی زندگی کا انحصار ہے، ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک قطرہ اس کا اس زمین پر ٹپکا دے، یہ خدا ہی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتی ہیں، پھر خدا ان کو بے آب وگیاہ علاقوں کی طرف ہانک دیتا ہے اور وہاں ان سے پانی برسا دیتا ہے جس سے ہر قسم کے پھل اور ہر قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں ۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ ۲۸-شوری (اور وہی ہے جو بارش اتارتا ہے بعد اس کے کہ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے) حتیٰ اذا اقلت سحابا ثقالا سقنا لبلد میت فانزلنا بہ الماء ۔ 'اقلال' کے معنی کسی چیز کو اس طرح اٹھا لینا ہے گویا اس میں کوئی وزن ہے ہی نہیں 'سحاب' سحابۃ کی جمع ہے لیکن صورۃً واحد ہے اس وجہ سے لفظ کے لحاظ سے 'سقنا' میں ضمیر اس کے لیے واحد لائے ۔ 'فانزلنا بہ' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح ہوائیں بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں گویا وہ روئی کے گالے ہیں اور پھر یہ ہم ہی ہیں کہ جدھر چاہتے ہیں ان کو ہانک کر لے جاتے ہیں اور جس جگہ چاہتے ہیں جل تھل کر دیتے ہیں، کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو اپنے پسند کردہ رخ پر موڑ سکے ۔ پس امید و بیم ہر حال میں اسی سے لو لگاؤ، اس کے سوا کوئی اور مصرّف اس کائنات میں نہیں ہے ۔

'کذلک نخرج الموتیٰ لعلکم تذکرون' ۔ یہ اسی بارش کی تمثیل سے ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلا دی ۔ وہ یہ کہ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش بھیج کر ایک بالکل مردہ اور بے آب وگیاہ زمین کو ہم از سر نو زندہ کر دیتے ہیں اسی طرح ایک دن ہم تمام مردوں کو زندہ کر دیں گے ۔ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں روز دیکھ رہے ہو، مردوں کو زندہ کر دینا اس کی قدرت سے کیوں بعید سمجھتے ہو؟ ہم نے تو یہ نشانیاں اس زمین میں نمایاں کی ہی اس لیے ہیں کہ ان آثار سے تم آخرت کے لیے یاد دہانی حاصل کرو ۔ 'لعلکم تذکرون' میں غایت بیان ہوئی ہے اس توجہ دہانی کی جو 'کذلک' کے اشارے میں مضمر ہے ۔

'والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا' ۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'طیب' اور 'خبیث' کے الفاظ جس

طرح معنوی و اخلاقی اعتبار سے خبیث و طیب کے لیے آتے ہیں اسی طرح مادی اعتبار سے خبیث و طیب کے لئے بھی آتے ہیں۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ 'البلد الطیب' سے مراد زرخیز اور ذی صلاحیت زمین اور 'والذی خبث' سے بنجر اور شور زمین ہے۔ پھر اس میں مقابل کے اصول پر جملہ کے پہلے حصہ میں 'نکدا' کا مقابل لفظ محذوف ہے۔ 'نکد' کے معنی ناقص اور قلیل کے ہیں اس وجہ سے جملہ کے پہلے حصہ میں طیب اور کثیر کا مضمون محذوف ہے۔

اب دیکھئے اسی بارش کی تمثیل سے ایک تیسری حقیقت کی طرف توجہ دلادی کہ خدا کا ابر کرم تو خشک و تر ہر جگہ یکساں برستا ہے لیکن فیض بقدر استعداد پہنچتا ہے۔ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش ہوتی ہے تو زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے لیکن بنجر اور شور زمین یا تو کچھ اگاتی ہی نہیں یا اگاتی ہے تو بس یونہی کچھ خار و خس اسی طرح قرآن کی صورت میں جو رحمت آسمان سے برسی ہے اس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا بلکہ استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پہنچے گا۔ جن کی فطری صلاحیتیں زندہ ہیں وہ تو باغ و چمن کی طرح لہلہا اٹھیں گے لیکن جنہوں نے اپنی صلاحیتیں ضائع کر دی ہیں ان سے عناد و عداوت کے خار و خس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھو۔ یہی حقیقت ایک حدیث میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی تمثیل یہ ہے کہ کسی خطۂ زمین پر بارش ہو تو جو ٹکڑا زرخیز ہوتا ہے وہ پانی کو قبول کر لیتا ہے اور خوب سبزہ اور نباتات اگاتا ہے۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو پانی کو روک لیتا ہے تو اللہ اس سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، لوگ اس سے پیتے ہیں، کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں اور اپنی فصلیں بوتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو محض چٹیل ہوتا ہے نہ پانی کو روکتا نہ سبزہ اگاتا۔ یہ تمثیل ہے ان لوگوں کی جو دین کی سمجھ حاصل کریں اور ان کو نفع پہنچے اس چیز سے جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے پس وہ سیکھیں اور سکھائیں۔ اور ان لوگوں کی جو اس کی طرف توجہ نہ کریں اور اس ہدایت کو قبول نہ کریں جس کو لے کر میں آیا ہوں۔

(بخاری و مسلم)

دیکھا آپ نے، ایک ہی بارش کی تمثیل سے کتنے حقائق آشکارا ہو گئے!۔ توحید کی دلیل بھی سامنے آ گئی، امکان معاد اور وقوع قیامت کی نظیر بھی مل گئی اور ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنت اللہ مقرر ہے وہ بھی نمایاں ہو گئی۔ گویا سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیر بحث آئے تھے اصولاً وہ سب ہی بے نقاب ہو گئے۔ ہم کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ

مذکورہ تمثیل سے انکار اور تصدیق کی طرف اشارہ

یہ کائنات پروردگار نے بنائی ہی ایسی شکل میں ہے کہ اگر انسان دیدہ بینا رکھتا ہو تو پتہ پتہ، بوٹا بوٹا ان حقائق کی شہادت دے رہا ہے جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان کہاں ہیں!!

'کذلک نصرف الآیات لقوم یشکرون' 'تصریف' کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں قرآن نے آیات کے لیے استعمال فرمایا ہے جس طرح ہواؤں کی گردش سے اس کائنات میں قدرت و حکمت اور رحمت و نعمت کے گوناگوں پہلو ظہور میں آتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ سے اپنی نشانیاں گوناگوں پہلوؤں سے نمایاں کرتا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں، پہچانیں اور ان کی قدر کریں۔ 'لقوم یشکرون' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ 'تصریف آیات' بہت بڑا احسان ہے بشرطیکہ اس کی قدر کرنے والے لوگ ہوں۔ لفظ 'شکر' کی اصل حقیقت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ قدردانی ہے۔ اسی قدردانی پر ہر نعمت کی افادیت کا انحصار ہے۔ اگر یہ قدردانی موجود نہ ہو تو جس طرح بھینس کے آگے بین بجانا لاحاصل اسی طرح ایسے بیلوں کے آگے ایک پھول کے سو سو رنگ سے مضمون باندھنا لاحاصل!

ہم سے طلب فرمائیں
مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تصنیف
دعوتِ دین
اور اس کا طریقِ کار
سائز ۱۸×۲۴ صفحات ۲۳۲ طباعت ۲ فونٹ خوشنما کور۔ قیمت پانچ روپے
(ایک روپیہ محصول ڈاک اس کے علاوہ)
دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۶ فون: ۶۹۵۲۲

مطالعۂ حدیث
مولانا عبد الغفار حسن
استاذ حدیث جامع اسلامیہ، مدینہ منورہ

انفرادی ملکیّت

گزشتہ شمارے میں " زراعت اور باغبانی کی فضیلت کے ذیل میں جو احادیث درج کی گئی تھیں ان سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ اراضی اور باغات انفرادی ملکیت میں رکھے جا سکتے ہیں اور اس معاملے میں کسی قسم کی حد بندی بے جا تصرف کے ہم معنی ہے —— چنانچہ نہ کسی با اثر فرد کے لیے درست ہے کہ وہ کسی کا حق ملکیت ساقط کر دے اور نہ کسی حکومت کے لیے جائز ہے کہ وہ عوام کی جائز ملکیت میں دخل دے اور فقراء و مساکین کی اعانت کے بہانے ان کو " قومیانہ " شروع کر دے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث لائق توجہ ہیں :-

(۱) انہ لا یحل مال امرئٍ مسلم الا بطیبۃ من نفسہ ،

کسی مسلمان کا مال حلال نہیں ہے مگر اس صورت میں جبکہ وہ خوش دلی سے دینے پر آمادہ ہو۔

حوالہ (سبل السلام ج ۳ صفحہ ۵۶ باب الحجر والتفلیس)
طبرانی بحوالہ مجمع الزوائد ج ۴ صفحہ ۱۷۱
- باب الغصب " "

(۲) مال تو مال کسی کی لاٹھی یا چھڑی بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں لے جا سکتی۔

لا یحل لامرئ ان یاخذ عصا اخیہ بغیر طیبۃ نفس منہ = رواہ الحاکم و ابن حبان سبل السلام ج ۳ صفحہ ۶۱ باب التفلیس والحجر

کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (دینی) بھائی کی لاٹھی اس کی رضامندی کے بغیر ہتھیا لے۔

(۳) بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا یحلبن احد ماشیۃ احد الا باذنہ	کوئی شخص کسی کے مویشی کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر نہ دوہے

صحیح بخاری ج ۳ صلا کتاب اللقطہ (مطبع المجالہ) مسلم ج ۱۲ ص۲۸ مع نووی کتاب اللقطہ

(۴) ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا یاخذن احد کم متاع اخیہ لاعبًا ولا جادًا	اپنے (مسلمان) بھائی کا سامان نہ تو ہنسی مذاق کے طور پر لیا جا سکتا ہے اور نہ قصد و ارادہ سے =

ابوداود مع عون المعبود کتاب الادب ج ۴ ص ۵۰۸ طبع ہند :
الترمذی مع تحفۃ الاحوذی کتاب الفتن ج ۶ ص ۳۷۹ طبع مصر :

مذکورہ بالا بخاری ومسلم کی روایت کا مفہوم قدرے اضافہ کے ساتھ ترمذی میں بیان ہوا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کا دوسرے کے مویشی کے پاس سے گزر ہو تو اگر مالک وہاں موجود ہو تو اس سے اجازت لے کر گائے بکری وغیرہ کا دودھ دوہ کر پی سکتا ہے، اگر موجود نہ ہو تو تین مرتبہ بلند آواز سے اس کو پکارے اس طرح اگر اس کا پتہ چل جائے تو اس سے اجازت لینی ضروری ہے لیکن اگر تین بار پکارنے اور آواز دینے کے باوجود مالک کا پتہ نہ چلے تو وہ دودھ نکال کر پی سکتا ہے لیکن ہمراہ نہیں لے جا سکتا، (ترمذی مع تحفۃ الاحوذی جلد ۴ ص۵۱۸ طبع مصر) صحیح مسلم کی روایت میں مویشیوں کے تھن اس گودام کے ساتھ تشبیہ دیئے گئے ہیں جہاں غلہ محفوظ کیا جاتا ہے (ج ۱۲ ص ۴۹ مع نووی)

واضح رہے کہ یہ اجازت بھی اس کے لیے ہے جو بھوک سے بیتاب ہو۔ جیسا کہ امام نووی نے کہا ہے (حوالہ مذکور)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اضطراری حالت میں شخصی ملکیت میں کسی دوسرے کا تصرف بقدر ضرورت جائز ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک حالت اضطرار ختم ہونے پر جو

کچھ کھایا پیا ہے اس کا بدلہ چکانا لازمی ہے اسی طرح ہنگامی حالات میں بھی حکومت کی طرف سے انفرادی املاک میں دخل اندازی جائز ہے بشرطیکہ یہ دخل اندازی شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے معقول طریقے پر ہو حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی اونٹنی پر سوار آپ کے پاس پہنچا لیکن اس کا حال یہ تھا کہ وہ دائیں بائیں اپنی نگاہ دوڑا رہا تھا (یعنی مدد طلب کرنے کے لیے) اس کی سواری میں سکت نہ تھی اس موقع پر آپ نے فرمایا جس کے پاس ضرورت سے زیادہ سواری موجود ہو وہ اس کو دے دے جو بالکل سواری سے محروم ہے اور جس کے پاس فالتو توشہ (زادراہ) موجود ہے وہ نادادوں اور بے پایہ لوگوں کے حوالے کر دے اس سلسلے میں آپ نے کئی قسم کے اموال کا ذکر فرمایا یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ فالتو چیزوں میں ہمارا کوئی حق ہی نہیں ہے ۔"

صحیح مسلم کتاب اللقطہ ج ۱۲ ص ۳۳ مع شرح نووی طبع مصر

یہ حدیث گویا تفسیر ہے قرآن حکیم کی اس آیت کی ۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ، قُلِ الْعَفْوَ	اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ
سورہ بقرہ آیت (۱۹) پ ۲	خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے ۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے محترم مولانا اصلاحی لکھتے ہیں :۔ "عفو" کے لفظ سے اشتراکی نظریات سے متاثر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ ناگزیر ضروریات سے فاضل آمدنی ایک اسلامی حکومت اجتماعی مقاصد کے لیے اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے اول تو یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادی رائے سے اس حد تک ایثار کے لیے تیار رہیں دوسرے یہ کہ اس چیز کا تعلق جیسا کہ واضح ہو چکا ہے عام حالات سے نہیں ہے بلکہ ایمرجنسی کے حالات سے ہے جب ملت کے تحفظ کا سوال سامنے آ کھڑا ہو ایسے حالات میں اول تو افراد خود ہی ہر طرح کی قربانیاں کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اگر حکومت کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتے ، اگرچہ اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح

کی جائے کہ ان کے اندر ارادہ اور اختیار کی آزادی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کا حوصلہ پیدا ہو اسلام کی نظر میں اس آزادی کی جتنی قدر ہے اتنی قدر مجبوری اور پابندی کی نیکی میں نہیں ہے۔"

تفسیر تدبر قرآن ج ۱ صد ۴۷۳ سورہ بقرہ پ۲

اسی تفسیر میں اس سے قبل بیان کیا گیا ہے :۔

" یہ جواب نہایت مختصر ہے مگر ساتھ ہی نہایت واضح اور قطعی ہے فرمایا" قل العفو" جو فاضل بچے وہ خرچ کرو ۔ فاضل سے مراد ظاہر ہے کہ آدمی اپنی اور بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچے وہ ہے ۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لئے صدقات واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہے بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کا تعلق جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاع ملت سے ہے ۔ ان مقاصد کے لیے ایک مسلمان پر انفاق کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی یہ آخری حد بتائی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت کے لئے ضرورت پڑ جائے تو اپنی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچ سکو وہ سب اس جہاد میں قربان کر دو قومی زندگی میں ایسے حالات و واقعات بھی پیش آتے ہیں جب قوم و مذہب کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اور دنیا کی ہر غیرت مند قوم خواہ کافر ہو یا مومن یہ بازی کھیلنے پر مجبور ہوتی ہے ۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہم اس قربانی اور جاں بازی کے لیے خوشی سے تیار رہیں ۔ تدبر قرآن ج ۱ صد ۴۷۲

ان ہنگامی حالات میں ملک و ملت اور دین کی خاطر جو کچھ ضروریات سے فاضل بچے خرچ کر ڈالنا مستحب ہو جاتا ہے اور کبھی واجب قرار پاتا ہے اس لیے ایک جہاد کے موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا سارا اندوختہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نصف سرمایہ (ترمذی مع تحفۃ الاحوذی طبع مصر ج ۱۰ صلا۱۶ مناقب ابی بکرؓ) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا تجارتی قافلہ چندے میں دے دیا تھا یعنی ۹۰۰ اونٹ اور ایک سو گھوڑے مع ساز و سامان کے عطا کئے ۔ جوامع السیرۃ ابن حزم صد ۱۵۰ ایک بے مایہ انصاری صحابی ابوعقیل رضی اللہ عنہ نے رات بھر ایک یہودی کا باغ سیراب کر کے مزدوری میں جو کھجوریں

حاصل کی تھیں ان میں سے آدھی فی سبیل اللہ دے دیں اور باقی بال بچوں کے لیے رہنے دی گئیں =
(الاصابہ ج ۴ صفحہ ۱۳۶ مع الاستیعاب)

حسب ذیل روایات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو کیا واضح ہدایات دی تھیں،

(۱) جب حضرت کعب بن مالکؓ کی توبہ قبول ہوئی تو آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

إن من توبتي ان انخلع من مالي صدقة الى الله والى رسوله فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أمسك بعض مالك فهو خير لك، قال فقلت اني أمسك سهمي الذي بخيبر، مسلم مع شرح نواوي ج ١٧ ص ٩٦ طبع مصر كتاب التوبة

(ترجمہ) میری توبہ کے تقاضے میں سے ہے کہ میں اپنے مال (جائیداد، باغات اور زرعی اراضی) سے دستبردار ہو جاؤں اور اسے بطور صدقہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے کر دوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے مال کا کچھ حصہ روک لو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، حضرت کعب کا بیان ہے کہ میں نے کہا کہ میں وہ حصہ روکے لیتا ہوں جو خیبر میں ہے،

(۲) ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:
لن تنالوا البرّ حتى تنفقوا مما تحبون۔

اس موقع پر حضرت ابوطلحہ مسجد نبوی میں حاضر ہوئے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے، (راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابوطلحہ کے کئی باغ تھے، یعنی دار ابن جعفر اور جو مکان اس کے متصل ہے، ابن جدیلہ کے محل تک ان باغات کا سلسلہ چلا گیا تھا، یہ سب ابوطلحہ کی ملکیت میں تھے، قصر ابن جدیلہ نامی باغ بیرحاء کے نام سے معروف تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لایا کرتے تھے اس کے پانی سے سیراب ہوتے اور اس کے پھل نوش فرماتے،) حضرت ابوطلحہ نے عرض کیا میرا پسندیدہ ترین مال "بیرحاء" ہے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لیے ہے، میں اس کے اجر اور ذخیرۂ آخرت بننے کی امید رکھتا ہوں، اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ جہاں چاہیں اسے

صرف فرمائیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابو طلحہ! یہ طرز عمل کیا خوب ہے، یہ مال نفع بخش ہے ہم تم سے قبول کرتے ہیں اور پھر تمہاری ہی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ تم اسے اپنے قریبی عزیزوں میں تقسیم کر ڈالو! اسی ارشاد کے مطابق ابو طلحہؓ نے اپنے رشتہ داروں کو یہ باغ صدقہ میں دے دیا، طحاوی کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نادار رشتہ داروں میں یہ باغ تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن عبد البرؒ (ف ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی اراضی کا ملکیت میں رکھنا مباح ہے، بنی نضیر اور فدک کی زمینیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں تھیں۔ اسی پر عمل کرتے ہوئے صحابہ کرام اور تابعین عظام نے باغات اور زرعی زمینیں اپنی ملکیت میں رکھیں۔ دور صحابہ اور تابعین سے اس کی مثالیں اتنی ملتی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس بارے میں سلف میں کوئی اختلاف نہ تھا۔" کتاب التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید ج ۱ صہ ۱۹۹ طبع جدید مطبع المملکۃ الرباط (المغرب)

حافظ ابن عبد البرؒ نے اس موقع پر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اس قول پر بھی تبصرہ کیا ہے کہ لا تتخذوا الضیعۃ فترغبوا فی الدنیا" اس بارے میں ضروری تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک مرتبہ اپنے شدید مرض کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ میری بیٹی ہی صرف وارث ہے، کیا میں اپنا دو تہائی مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں، آپ نے فرمایا "نہیں" سعد نے کہا آدھا مال صدقہ کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا۔ نہیں، سعد نے گزارش کی (اچھا) ایک تہائی مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر ڈالوں؟ آپ نے جواب دیا ہاں، ایک تہائی (بھی) بہت ہے۔ تم اپنے رشتہ داروں کو خوش حال چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں کنگال چھوڑ کر مرو، کہ وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے پھریں۔ [1] صحیح بخاری کتاب الجنائز، صحیح مسلم کتاب الوصیہ

ان روایات سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:- (۱) زرعی اراضی اور باغات شخصی ملکیت میں رکھے جا سکتے ہیں۔ شریعت میں اس بارے میں کوئی حد بندی نہیں معلوم ہوتی۔

[1] اس حدیث کی مفصل تشریح کسی دوسرے موقع پر عرض کی جائے گی۔ انشاء اللہ

(۲) ملک و ملت کے تحفظ اور دفاع کا سوال ہو تو ایک مسلمان اپنا [illegible] کی راہ میں [illegible] سکتا ہے، عام حالات میں اس روش کو اسلام پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا۔
(۳) صدقہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے قریبی نادار عزیزوں کا خیال رکھنا چاہیے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے، . . . .

خیر الصدقۃ ما کان عن ظہر غنی وابدء بمن تعول	بہتر صدقہ وہ ہے جو خوشحالی کی بنیاد پر ہو، یعنی صدقہ کرنے کے بعد کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے) اور ابتدا اس سے کرو جن کے نان نفقہ کے تم ذمہ دار ہو۔
صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۳ ص۲۹۴ کتاب الزکاۃ باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی ۔	

مذکورہ بالا احادیث گویا حسب ذیل آیت کی تفسیر ہیں۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا" سورہ الاسراء، آیت نمبر ۲۹	اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

اس سے بعد والی آیت میں اس حکم کی حکمت بھی بیان فرمادی،

ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انہ کان بعبادہ خبیرا بصیرا۔ آیت (۳۰)	بے شک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے اور (ان کو) دیکھ رہا ہے۔

حافظ ابن حجر نے بعض شارحین کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک موقع پر اپنا سارا مال لٹا دینا اس بنا پر ہے کہ ان کو اپنی خودداری، صبر و قناعت پر پورا پورا اعتماد تھا، اسی طرح جو شخص بھی اس قسم کا جگر گردہ رکھتا ہو اور اس کے اہل وعیال بھی اس کے ہم نوا ہوں تو وہ بھی سخاوت و ایثار کا یہ نمونہ پیش کر سکتا

ہے۔ فتح الباری ج ۳ ص۲۹۵ کتاب الزکوٰۃ باب لاصدقہ الا من ظہر غنی۔

متعارض روایات میں تطبیق } اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا بھی صحیح مفہوم متعین کر دیا جائے جن سے بظاہر زراعت و باغبانی کی مذمت معلوم ہوتی ہے۔

(جاری)

ہم سے طلب فرمائیں

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

تالیف: ڈاکٹر اسرار احمد ایم بی بی ایس - ایم اے (اسلامیات)

یہ رسالہ، جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ نے ان حقوق و فرائض کی تشریح کے مقصد سے لکھا ہے جو ایک مسلمان پر قرآن سے متعلق عائد ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں قرآن پر ایمان کے مدعیوں کی کمی نہیں ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ایمان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سلمہ نے قرآن کے دلائل کی روشنی میں ان تقاضوں اور مطالبوں کی تشریح کی ہے اور بیک نظر محسوس ہوتا ہے کہ نہایت خوبی اور نہایت جامعیت کے ساتھ تشریح کی ہے۔ انداز بیان نہایت دلنشیں، دلائل نہایت محکم اور اسلوب خطاب نہایت ہی مؤثر اور دردمندانہ ہے۔ ہر مسلمان جو قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے، اس رسالے میں بہترین رہنمائی پائے گا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

سائز ۲۲×۱۸/۸، صفحات ۷۲، طباعت آفسٹ، خوشنما کور۔ قیمت فی نسخہ: ایک روپیہ

شائع کردہ:

دارالاشاعت الاسلامیہ۔ کوثر روڈ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور۔ فون: ۶۹۵۲۲

یاد رفتگاں

ڈاکٹر رفیع الدین (مرحوم)

اسلام کے ایک بلند پایہ فلسفی

(از: شجاع الدین)

(شجاع الدین احمد صاحب ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کے فرزند ہیں، اور انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں زیر تعلیم ہیں ——— ادارہ)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین جو ۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء کو کراچی میں ٹریفک کے ایک اندوہناک حادثے میں جاں بحق ہو گئے، اسلام کے ایک بلند پایہ فلسفی اور بے انتہا خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی اچانک موت سے علمی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا ممکن نہیں۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی ذاتیات سے بالاتر ہو کر قوم و ملت کی خدمت کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ اور قوم کی فلاح و بہبود کا خیال انہیں ایک جنون کی حد تک تھا۔ افسوس ہے کہ قوم نے جیتے جی ان کی کوئی قدر نہ کی اسی لیے ان کا فلسفہ عوام میں مقبول نہ ہو سکا۔ اور انہوں نے ایک نہایت اعلیٰ پایہ کے مصنف و مفکر ہونے کے باوجود تقریباً گمنامی ہی کی زندگی گزاری۔ آج میں نے سوچا کہ ان کی جو یادیں اب ہمارا سرمایہ ہیں ان میں کیوں نہ قارئین کو بھی شریک کر لیا جائے تاکہ وہ اس شخصیت کی عظمت کا بھی کچھ اندازہ لگا سکیں اور ان کی علمی خدمات سے بھی متعارف ہوں۔

آپ جموں میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے اور اپنی تدریسی زندگی کا آغاز سری پرتاپ سنگھ

کالج سرینگر میں عربی اور فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے کیا۔ اس کے بعد آپ پرنس آف ویلز کالج جموں میں تقریباً بارہ برس تک عربی و فارسی کے پروفیسر رہے۔ بنیادی طور پر آپ عربی کے طالب علم تھے، اور ایم۔ اے عربی میں کیا تھا مگر ۱۹۴۲ء میں آپ نے فلسفہ پر ایک معرکتہ الآرا کتاب "IDEOLOGY OF THE FUTURE" لکھی۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں جموں میں چھپی اور اسی کتاب کی بدولت آپ ایک فلسفی کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس کتاب پر آپ کو فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دی۔ اس طرح بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ پیدائشی فلسفی تھے۔ یہی وہ کتاب تھی جس پر آپ کے تمام فلسفے کی بنیاد قائم ہے۔ اس کتاب کی متحدہ ہندو پاک کے بڑے بڑے مفکروں اور مشہور فلسفیوں نے تعریف کی جن میں پروفیسر سید ظفر الحسن، پروفیسر للّی اور ڈاکٹر رادھا کرشن کے نام قابل ذکر ہیں۔

فطری طور پر آپ مستقبل کے بارے میں نہایت پر اُمید (OPTIMIST) تھے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر یقین کامل رکھتے تھے۔ چنانچہ IDEOLOGY OF THE FUTURE کو اختتام پر پہنچاتے ہوئے اس کے باب "POLITICS AND WAR" میں علمی حقائق کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قوموں کی نظریاتی کشمکش سے ایک ایسی ریاست کا وجود میں آنا ناگزیر ہے جو اس فلسفے پر قائم ہوگی جس کا نام فلسفہ خودی ہے، اور یہی وہ ریاست ہوگی جو رفتہ رفتہ ساری دنیا پر چھا جائے گی۔ پاکستان بننے کے بعد آپ نے ایک کتاب اردو میں "پاکستان کا مستقبل" کے نام سے لکھی۔ جس کے پیش لفظ میں آپ نے لکھا تھا۔ "جس ریاست کا ذکر ۱۹۴۲ء میں میں نے اپنی کتاب IDEALOGY OF FUTURE میں کیا تھا میرے خیال کے مطابق وجود میں آچکی ہے اور یہ پاکستان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اس ریاست کا سرکاری نظریہ فلسفہ خودی رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ریاست نظریاتی طور پر ساری دنیا پر نہ چھا جائے۔"

اس لحاظ سے آپ کی آخری کتاب "حکمت اقبال" کا انتساب بھی بڑا معنی خیز ہے یعنی "ان عاشقانِ جمالِ ذات کے نام جو مستقبل کی اس ناگزیر عالمی ریاست کا آغاز کریں گے جو اسلام کی اُس حکیمانہ توجیہ پر قائم ہوگی جس کا نام فلسفہ خودی ہے۔" میرے ناقص خیال میں آپکے فلسفے کا اصل حاصل یہی تھا جو آپ نے چند الفاظ میں 'حکمتِ اقبال' کے انتساب میں سمو دیا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد آپ یہاں اسلامی تحقیق کے مختلف اداروں سے منسلک رہے۔ پاکستان پبلک سروس کمیشن نے آپ کو انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں انفارمیشن آفیسر اور سول سروسز اکیڈمی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر کی اسامیاں پیش کیں لیکن آپ نے وہاں جانا منظور نہ کیا۔ اس کے بعد آپ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے وابستہ رہے جہاں اس وقت خلیفہ عبدالحکیم ڈائریکٹر تھے۔

یہاں پر آپ نے اپنی کتاب "قرآن اور علم جدید" لکھی، جو ۱۹۵۲ء میں چھپی۔ آپ کا خیال تھا کہ اس وقت اسلام کو یورپ کے غلط نظریات کے علمی اور عقلی چیلنج کا سامنا ہے جو مقبول عام نظریات مثلاً فرائڈ ازم۔ میکڈوگل ازم۔ مارکسزم اور میکاولی کے فلسفہ ریاست کی صورت میں اسلام سے نبرد آزما ہیں۔ جب تک مسلمان ان نظریات کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے کے بعد ان کی خامیوں کو اسی طریق استدلال سے بے نقاب نہ کر دیں جس سے وہ فلسفے وجود میں آئے ہیں۔ اسلام کا اُن نظریات کے سیلِ رواں کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہیں ہے اور ہم ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ یہ تمام نظریے اسلام کے سامنے ناقص ہیں۔ مزید برآں مرحوم کا یہ خیال بھی تھا کہ ہمیں مندرجہ ذیل تین سوالوں کا جواب بھی اس طرح دینا چاہیئے کہ جدید انسان کے عقلی تقاضوں کو پورا کر سکے یعنی (۱) مذہب کیا ہے؟ (۲) مذہب کی ضرورت کیا ہے؟ اور (۳) کیوں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔؟

قرآن اور علم جدید دراصل یورپ کے انہی غلط نظریات کے جواب میں لکھی گئی ہے اور شاید عالم اسلام میں کسی مفکر کی اس قسم کی پہلی کوشش ہے۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ "چیلنج" اور دوسرا حصہ اس کا "جواب" ہے۔ اس کتاب کے متعلق ملکی و غیر ملکی مسلمان مفکروں کی رائے نہایت بلند ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے 'صدق جدید' کی اشاعت میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا: "کتاب عوام کے کام کی بالکل نہیں صرف پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقے کے مطالعے کے قابل ہے۔ گو کہ اس طبقے میں بھی اس کتاب کے سمجھنے والے بہت کم نکلیں گے ... اگر مولانا ابوالحسن علی ندوی چاہیں تو اسے ندوہ کے تعلیمی نصاب میں رکھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کے پڑھانے والا ایک بھی شخص دستیاب ہو سکے۔"

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے۔ "جدید ارتداد کی موجودہ نوعیت کی طرف توجہ ڈاکٹر رفیع الدین کی

فاضلانہ کتاب قرآن اور علم جدید کے ابتدائی صفحات کو پڑھ کر ہوئی جس میں بڑی خوبی کے ساتھ اس تخیل کو پیش کیا ہے۔ راقم سطور نے بنیادی تخیل تو اپنے عربی مضامین میں جس کا ترجمہ پیش نظر ہے مزید توضیح اور اضافہ اور عملی تشکیل دعوت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اب وہ ایک موضوع فکر اور دعوت عمل کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔"

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بعد ۱۹۵۳ء میں اقبال اکیڈمی کراچی کے قیام کے بعد آپ کو اس کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا جہاں آپ نے ۱۹۶۵ تک کام کیا۔ اس عرصے میں آپ نے اکیڈمی کے سہ ماہی مجلہ "اقبال ریویو" کا اجرا کیا اور یہی زمانہ تھا جہاں آپ کو جم کر کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی میں آپ نے فلسفہ تعلیم پر اپنی کتاب — FIRST PRINCIPLES OF EDUCATION" لکھی جس پر آپ کو پنجاب یونیورسٹی نے فلسفہ میں D.LIT کی ڈگری دی۔ اس کی علمی افادیت کے پیش نظر اسی کتاب کا اردو ترجمہ "تعلیم کے ابتدائی اصول" کے نام سے سید الطاف علی بریلوی صاحب نے حال ہی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے شائع کیا ہے۔

آپ اقبالیات پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن دنوں ملک میں سوشلزم کا نعرہ لگ رہا تھا، آپ بے حد مضطرب تھے اور ہر محفل میں اٹھتے بیٹھتے اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ ان دنوں آپ اپنی آخری کتاب "حکمت اقبال" جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے مکمل کر چکے تھے۔ مگر جب لوگوں نے اقبال کو سوشلسٹ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی تو آپ نے اس بات کی ضرورت کو محسوس کیا کہ 'حکمت اقبال' میں ایک اور باب کا اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے "خودی اور سوشلزم" کا باب انہی دنوں میں لکھا۔ سوشلزم اور اقبال سے متعلق آپ کا استدلال یہ تھا کہ "اسلامی سوشلزم" اسی طرح کی مضحکہ خیز اصطلاح ہے۔ جیسی کہ "اسلامی عیسائیت" "اسلامی ہندویت" یا "اسلامی دہریت"۔ اگر ہمیں یہ اصطلاحات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں تو آخر ہم اسلامی سوشلزم کیوں اپنا لیں۔ اُن کے نزدیک سوشلزم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ اصل انسان یعنی خودی کی ضرورت یعنی خدا کی محبت کو نظر انداز کر کے اس کی سواری یعنی جسم کے قیام اور بقا کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک ٹٹو پہ سوار ہو کر گھر جانے والا مسافر راستے میں صرف ٹٹو پہ ہی مر مٹے اور اسی کی خاطر و مدارات میں لگا رہے یہاں تک کہ شام ہو جائے اور چور اس کا سامان

لوٹ کر اُسے قتل کرجاہیں ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اقبال نے جس اسلامی سوشلزم کا تذکرہ کیا تھا اس سے اس کی مراد درحقیقت اسلام ہی تھی ۔ جس کا حوالہ دے کر ہم ایک اور ہی خطرناک قسم کا سوشلزم لانا چاہتے ہیں اور جس کے خطرناک نتائج دوسرے اسلامی ممالک میں آزمائے جاچکے ہیں ۔ کیونکہ "اسلامی سوشلزم" کا امتیاز یہ ہے کہ وہ خدا کی شدید محبت سے پیدا ہوتا ہے ۔ اس لیے ہمیں اقبال کا اسلامی سوشلزم لانے سے پہلے اس کا نظام تعلیم جو خودی کی پرورش کرتا ہے ۔ لانا پڑے گا ۔ جب اقبال یہ کہتا ہے کہ اشتراکیت + خدا = اسلام ، تو اس سے یہ تاثر لینا غلط ہے کہ اقبال نے اشتراکیت کی حمایت کی ہے ۔ بلکہ جب اشتراکیت میں خدا جمع کر دیا جائے گا تو وہ کلّیتہً اسلام بن جائے گی ۔ پھر وہ یہ نہیں کہے گی کہ حقیقت کائنات مادّہ ہے بلکہ پھر وہ کائنات کی حقیقت خدا کو قرار دے گی ۔ پھر وہ انسان کو فقط جسم کی بجائے خودی قرار دے گی ۔ اور مادّہ کو اس کا خدمت گزار تصور کرے گی ۔ اور پھر اس طرح اس کا نظام تعلیم ، نظام سیاست ، نظام اخلاق اور نظام قانون خدا کی محبت کے عقیدے پر قائم ہوجائے گا ۔ جب لوگ بھولے پن سے سوچتے ہیں کہ ان کے سوشلزم کا بے خدا دہریت کے فلسفے سے تعلق نہیں ہے ۔ بلکہ وہ سوشلزم کا معاشی نظام لانا چاہتے ہیں ۔ تو وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔

تعلیم کے متعلق آپکا نظریہ یہ تھا ۔ کہ مسلمان قوم کو سب سے پہلے تعلیم کا نصب العین اور مقصد متعین کرنا چاہیئے ۔ مسلمانوں کی مذہب سے بیزاری اور خدا کی محبت کا فقدان دراصل غلط تعلیم کا نتیجہ ہے ۔ ہم جو سائنسی اور معاشرتی علوم حاصل کرتے ہیں وہ بے خدا ہیں جسے آپ INTELLECTUAL SECULARISM کا نام دیتے ہیں اور انسانیت کو اخلاقی تباہی سے بچانے کے لیے ہمیں علوم کی اس بے خدائیت کے خلاف جہاد کرنا ہوگا ۔ جب تک یہ کام نہ ہوگا مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا کام ایک بہت مشکل امر ہے ۔ اس کے لیے سائنس اور اسلام کے درمیان ایک حسین امتزاج پیدا کرنا ضروری ہے ۔

اقبال اکیڈمی کراچی سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے اس موضوع پر بہت سے پُرمغز مقالات لکھے اور کہا کہ ہمیں سائنس کی تمام کتابوں کو ازسرِ نو اس طرح لکھنا چاہیئے کہ خدا کا تصوّر ان میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کر جائے ۔ صرف اسلامیات کو ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت سے پڑھانے سے اسلامی تعلیم کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ

سے ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں یہ تاثر نہ پکڑ جائے گا کہ مذہب کا درحقیقت سائنس، سیاست اخلاق اور قانون سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی زمانے میں آپ کی ملاقات ملک خدا بخش بچہ صاحب سے ہوگئی جو اس وقت وزیر تعلیم تھے۔ انہوں نے اس خیال کو بہت پسند فرمایا اور انہیں مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ میں تعینات کرانے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ اسلامی تعلیم کے اس تجربہ کو عملی جامہ پہنا سکیں مگر محکمانہ دشواریوں کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔

اس کے بعد آپ نے اس کام کو نجی طریقہ پر ہی کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور ملک خدا بخش بچہ کی سرپرستی میں ۱۹۶۶ء میں لاہور میں "آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس" کی بنیاد ڈالی اور ایک رسالہ "اسلامک ایجوکیشن" جاری کیا۔ اس ادارے کا مقصد سائنس کی درسی کتابوں کو REVISE کرنے کے بعد ایک "ماڈل کالج آف اسلامک ایجوکیشن" کا قیام عمل میں لانا تھا۔ مگر اس راہ میں فنڈز کی دشواریاں حائل رہیں۔ اور نہ عوام نے کوئی مدد کی نہ حکومت نے، حتیٰ کہ موت اس منصوبے کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کی راہ میں حائل ہوگئی۔

بڑے بڑے غیر ملکی سکالرز نے آپ کی تحریروں کو سراہا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے متعلق تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تو یہاں تک لکھا ہے:۔

"کم از کم پاکستان میں تو کہنا چاہیئے کہ اقبال مرحوم کے بعد سب سے بڑے اسلامی مفکر وہی ہیں اور ممکن ہے کہ ہندوستان اور عالم اسلام میں دو چار ان کی ٹکر کے نکل آئیں۔"

آپ کی کتاب MANI FESTO OF ISLAM کے تراجم عربی اور فارسی میں ہو چکے ہیں اور ان کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا تھا۔ "زبان اس کی بھی وہی علمی اور فلسفی ہے اور اس لحاظ سے اقبال اکیڈمی کے یہ ڈائریکٹر بالکل اقبال کے نقش قدم پہ ہیں۔ گویا ان کے فلسفہ خودی کی شرح لکھ رہے ہیں۔ اور ان کے انگریزی لیکچروں کا تکملہ لکھ رہے ہیں۔"

پاکستان میں بھی چوٹی کے علماء ان کے متعلق نہایت اونچی رائے رکھتے تھے مگر عوام کے سامنے اس کا اعتراف کبھی نہ ہوا۔ اس لیے آپ عوام میں مقبول نہ ہو سکے۔ ان چند آراء کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ قارئین کو اندازہ ہو کہ وہ علم و فن کے کس مرتبے پہ فائز تھے مگر علم کے اس مرتبے پہ ہونے کے باوجود انکی طبیعت میں بلا کا

انکسار تھا۔ اور اسی مناسبت سے آپ کے گھر کا ماحول بہت سادہ تھا۔ چونکہ ان کو اپنے کام سے کام تھا اور دوسرے کاموں کے لیے آپ وقت نہ نکال سکتے تھے اس لیے آپ زیادہ سوشل محفلوں میں شریک نہ ہوتے تھے۔

اپنی قابلیت پر اعتماد ہونے کی وجہ سے آپ نے کبھی کسی کی خوشامد نہ کی اور ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے زندگی میں جس مقام کے وہ حقدار تھے انہیں نہ مل سکا۔

یہ تو خیر وہ باتیں تھیں جو ہو چکیں۔ اب ہم کو چاہیئے کہ اگر ان کی زندگی میں ان کی کوئی قدر نہ کر سکے تو قوم کے اس سرمائے کی قدر کریں جو ان کے فکر کی صورت میں ان کی کتابوں میں محفوظ ہے اور اس کی نشر و اشاعت کی کوشش کریں۔ شاید اسی طرح ہم قوم کے اس عظیم مفکر کو خراجِ تحسین پیش کر سکیں۔

ہم سے طلب فرمائیں

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

کا بصیرت افروز مقالہ

تحقیقِ اسلامی کا مفہوم، مدعا اور طریقِ کار

یعنی

ہمارے ملک کے اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے

کرنے کا اصل کام

سائز ۲۲×۱۸/۸، صفحات ۴۸، طباعت و کتابت دیدہ زیب

قیمت: قسم اعلیٰ (سفید کاغذ) ڈیڑھ روپیہ

قسم دوم (نیوز پرنٹ) ایک روپیہ

دار الاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، کرشن نگر لاہور

الاخبار العلمیہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

الحاکم ابوعبداللہ نیسابوری
اور اس کی
المدخل الی معرفۃ الاکلیل

ابوعبداللہ الحاکم نیشاپوری کی تالیف المدخل الی معرفۃ الاکلیل ۱۹۵۳ء میں R.A.S. لندن نے شائع کی تھی جس پر ڈاکٹر ولسن پروفیسر عربی مانچسٹر یونیورسٹی نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا تھا۔

ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن نعیم الحاکم النیسابوری ولادت ۳۲۱ھ بمقام Nishapur، آغاز تعلیم حدیث ۳۳۰ھ۔ سفر عراق ۳۴۱ھ برائے سماعت حدیث دوسرا سفر عراق ۳۶۰ھ۔ ۳۵۵ھ میں ماوراء النہر میں درس حدیث دیا اور ۳۶۷ھ میں عراق میں۔

اس نے دو ہزار شیوخ سے سماعت حدیث کی تھی۔ اور اس سے متعدد محدثوں نے روایت کی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ دارقطنی نے بھی جو اس کے شیخ تھے، اس سے روایت کی ہے۔

تصانیف: (۱) الصحیحان ۲۔ العلل ۳۔ الامالی۔ ۴۔ فوائد المنتخ ۵۔ فوائد الخراسانیین ۶۔ التلخیص ۷۔ تراجم الشیوخ ۸۔ معرفۃ انواع علوم الحدیث ۹۔ تاریخ علماء نیسابور ۱۰۔ کتاب مزکی الاحباد ۱۱۔ الاکلیل فی دلائل النبوۃ۔ ۱۲۔ المدخل الی علم الصحیح ۱۳۔ المستدرک علی الصحیحین ۱۴۔ فضائل الشافعیؒ ۱۵۔ فضائل فاطمہؓ۔

اگرچہ علماء اس کی وسعت معلومات کے معترف تھے مگر انہوں نے اس پر تنقید

بھی کی۔ مثلاً یاقوت نے اپنی تاریخ العلما میں اسمٰعیل بن ابوالفضل القومصی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں تین حفاظ حدیث سے اس لیے نفرت کرتا ہوں کہ وہ شدید جانبدار اور متعصب تھے (۱) الحاکم ابوعبداللہ (۲) ابونعیم الاصبہانی (۳) ابوبکر الخطیب"

خطیب بغدادی نے اس پر رافضی ہونے کا الزام لگایا ہے (تاریخ بغداد جلد ۵ ص۴۷) لیکن ذہبی اور سبکی نے اس الزام کی تردید کی ہے۔ اس کے باوجود ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں المستدرک کی اس روایت پر اعتراض کیا ہے کہ جب آنحضرتؐ کے سامنے کسی پرند کا گوشت پیش کیا گیا تو آپؐ نے اللہ سے دعا کی کہ جسے میں سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں اسے بھیج تاکہ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے۔ اسی وقت حضرت علیؓ آپؐ کے پاس آئے اور کھانے میں شریک ہو گئے۔

تاہم یہ بات غور طلب ہے کہ ترمذی نے اس حدیث کو اپنی تالیف میں درج کیا ہے اور اسے غریب قرار دیا ہے۔ سبکی نے اپنی طبقات میں الحاکم کی حمایت کی ہے اور لکھا ہے کہ جب دارقطنی نے الحاکم کو یہ بتایا کہ پرندے والی روایت صحیح نہیں ہے تو اس نے اس روایت کو اپنی المستدرک سے خارج کر دیا تھا۔

الحاکم نے اپنی تصنیف المدخل میں موضوع احادیث کے حسب ذیل اسباب بیان کئے ہیں

(۱) بعض زنادقہ مثلاً المغیرہ ابن سعید الکوفی، ابوعبدالرحیم الکوفی اور محمد بن سعید الشامی نے جھوٹی احادیث وضع کیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کریں۔

(۲) بعض لوگوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے احادیث وضع کیں۔ مثلاً ابوالعیناع نے کہا کہ میں نے اورجا حفظ نے فدک کے بارے میں جھوٹی روایات بنائیں اور انہیں شیوخ بغداد میں شائع کیا۔ اسی طرح سلیمان بن حرب کا قول ہے کہ ابوالعیناع نے چار سو احادیث وضع کی تھیں۔

(۳) بعض لوگوں نے حصول ثواب اخروی کی نیت سے احادیث وضع کیں تاکہ آنحضرتؐ کا نام لے کر لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کر سکیں۔

(۴) بعض لوگوں نے بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے احادیث وضع کیں۔ مثلاً غیاث ابن ابراہیم جب المہدی عباسی کی خدمت میں حاضر ہوا جو کبوتروں کا شوقین تھا، تو اس نے

کبوتروں کی تعریف میں ایک حدیث خلیفہ کو سنائی جو بالکل جھوٹی تھی۔
(۵) بعض لوگوں نے وقتی ضرورت کے لیے احادیث وضع کیں۔
(۶) بعض بھکاری لوگوں سے بھیک حاصل کرنے کے لیے حسب موقع احادیث وضع کر لیتے ہیں۔
(۷) بعض علماء دفات یافتہ شیوخ سے اپنا رشتہ ثابت کرنے کے لیے احادیث وضع کر لیتے ہیں۔
(۸) بعض علماء یہ کرتے ہیں کہ تابعین کی روایات کو آنحضرت صلعم تک پہنچانے کے لیے انہیں کسی صحابی سے منسوب کر دیتے ہیں تاکہ سلسلۂ اسناد مکمل ہو جائے۔
(۹) بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ اپنے شیوخ سے سنتے ہیں اُسے آنحضرت صلعم سے منسوب کر دیتے ہیں۔
(۱۰) بعض لوگ ایسے ہیں جو فن حدیث باقاعدہ حاصل نہیں کرتے لیکن جب کوئی طالب علم ان کے پاس آکر کوئی حدیث سناتا ہے تو وہ بلا تحقیق اس کی تصدیق کر دیتے ہیں (اقتباس ختم شد)

لوٹ از مقتبس :- حاکمؒ کے تعصب کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس نے واضعین حدیث کی اس فہرست میں اس طبقے کے کسی فرد کو شامل نہیں کیا جو عبداللہ ابن سبا کا پیرو تھا۔ حالانکہ اسی طبقے کے افراد نے جھوٹی حدیثیں وضع کرنے کا "مبارک" سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کار خیر میں اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ العاقل تکفیہ الاشارہ۔

ہم سے طلب فرمائیں

علامہ محمود احمد عباسی کی تازہ تصنیف

وقائع زندگانی امّ ہانی رضی

جس میں پیروان ابن سبا کی بہت سی غلط روایتوں کا پول کھولا گیا ہے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۹۲، قیمت تین روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ۔ اسلام پورہ۔ لاہور ۱

تاریخ تصوفِ اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

محمدؐ ابن عبدالجبّار ابن الحسن النفری

(م ۳۵۴ھ)

صاحب کتاب المواقف والمخاطبات

—— (۲) ——

آخر میں مواقف میں سے موقف ہشتم کا اور مخاطبات میں سے مخاطبۂ پنجاہ و ششم کا ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ قارئین نفری کے افکار سے براہ راست آگاہ ہو سکیں۔ میری رائے میں ان اقتباسات سے ان دو کتابوں کی روح سے تذرے شناسائی ہو سکتی ہے : وما توفیقی الّا باللہ۔

موقف ہشتم (موقف الوقفہ)

اوقفنی فی الوقفۃ وقال لی ان لم تظفر بی البین یظفر بک سوائی الخ

(۱) پس خدا نے مجھے وقفہ میں وقوف (قیام) عطا کیا اور مجھ سے کہا "اگر تو مجھ پر ظفر حاصل نہیں کرے گا (مجھے اپنا نہیں بنائے گا) تو کیا پھر میرا غیر تجھ پہ ظفر حاصل نہیں کرلے گا۔ یعنی تجھے اپنا نہیں بنا لے گا؟

(۲) جس نے میرے وسیلے سے وقوف حاصل کر لیا میں اسے زینت کا لباس پہنا دیتا ہوں، جس کے بعد اسے کسی شئے میں زینت نظر نہیں آتی (جو مجھ میں وقوف (قیام) حاصل کر لیتا ہے وہ اس قدر مزین ہو جاتا ہے کہ اسے کسی زینت کی ضرورت نہیں رہتی)

(۳) وقفہ کے لئے اپنے آپ کو پاک کرلے ورنہ وہ (وقفہ) تجھے اپنے سے دور کر دے گا۔ (جو طاہر نہیں ہے وہ میری بارگاہ میں بار نہیں پا سکتا)

(۴) اگر تجھ میں غیراللہ کے لئے کوئی دلکشی باقی ہے تو واقف نہ ہو سکے (اگر غیراللہ کا خیال میرے دل میں موجود ہو گا تو تو مجھ تک نہیں پہنچ سکتا)

(۵) جب تو واقف ہو جائے گا تو غیراللہ کو اس کے صحیح مقام میں دیکھ لے گا اور دیکھنے کے بعد اس سے جدائی اختیار کرلے گا (واقف کی نگاہ میں غیراللہ کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی)

(۶) وقفہ منبع علم ہے جو واقف ہے اس کا علم اس کی ذات میں منحصر ہو جاتا ہے مگر جو واقف نہیں ہے اس کا علم ہمیشہ اپنے بغیر سے متعلق رہتا ہے (وہ اپنے آپ سے آگاہ نہیں ہو سکتا)

(۷) واقف ایک ہی قانون کے مطابق بولتا اور خاموش ہوتا ہے۔

(۸) وقفہ ایک نورِیت ہے جو اقدار کو واضح کرتی ہے اور خواطر (خیالات ماسوی) کو مٹا دیتی ہے۔

(۹) وقفہ طلسم روز و شب سے وراء ہے اور اُن اقدار سے بھی وراء ہے جو ان دونوں میں موجود ہیں۔ (واقف زماں و مکاں سے بالاتر ہو جاتا ہے)

(۱۰) وقفہ عزیمت کے لئے بمنزلہ نار ہے۔ اگر میں عزیمت کو اس کے ذریعے سے جلا دوں تو یہ تیرے حق میں بہتر ہے ورنہ میں اِس آگ سے تجھے جلا دوں گا۔

(۱۱) واقف ہر مکان میں داخل ہوتا ہے مگر کوئی مکان اسے اپنے اندر نہیں سما سکتا اور وہ کسی مکان میں نہیں سما سکتا۔ وہ ہر چشمے سے پانی پیتا ہے مگر سیر نہیں ہو سکتا پھر وہ مجھ تک پہنچتا ہے اور میں اس کا مسکن (منزل) بن جاتا ہوں اور میرے ہی پاس اس کا موقف ہوتا ہے۔

(۱۲) جب تجھے وقفہ کی معرفت حاصل ہو جائے گی تو معرفت تجھے قبول نہیں کرے گی اور حدثان (حدوث) تیرے ساتھ الفت نہیں کرے گا (تو حدوث سے بیگانہ ہو جائے گا)

(۱۳) جس نے علوم وقفہ میں اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا تو میں اس کے لئے پشت بن جاتا ہوں جس کا وہ سہارا لیتا ہے اور اس کے لئے عصا بن جاتا ہوں جسے وہ تھامتا ہے۔

(۱۴) اگر تو وقفے میں مجھے پکارے تو وقفے سے خارج ہو جائے گا۔ اگر تو وقفے میں وقوف کرے تو بھی وقفے سے خارج ہو جائے گا۔

نوٹ | صاحب المواقف نے پوری کتاب اسی مغلق انداز میں لکھی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ "وقفہ" نفری کی اصطلاح میں وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر سالک اپنی خودی سے نکل کر خدا میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے جس طرح مچھلی پانی میں رہتی ہے اور من و تو کا قصہ ختم ہو جاتا ہے، دوئی باقی نہیں رہتی۔ جس طرح لوہا آگ میں پڑ کر آگ ہو جاتا ہے۔ نفری کی اصطلاح میں وقفہ کا معنی مدتِ زمانی نہیں ہے جو معروف ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں کچھ وقفے کے بعد یہ کام کروں گا بلکہ وقفہ کا معنی ہے سالک کا ذات باری میں وقوف یا قیام کرنا۔ یہ وقوف یا اصطلاحی وقفہ ہی نفری کے فلسفے میں معراج انسانی ہے اس کے اوپر کوئی مقام نہیں ہے۔ اب ان کے الہامی جملے کا مطلب لکھتا ہوں۔ اگر سالک خدا کی ذات میں قائم یا واقف ہونے کے بعد بھی اسے پکارتا ہے۔ تو وہ واقف نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا میں نہیں ہے اس سے دور ہے ورنہ ہرگز نہ پکارتا۔ کوئی مچھلی

پانی میں رہ کر پانی کو نہیں پکار سکتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ تو خود پانی میں ہے۔[1] اسی طرح واقف خدا میں وقوف کرتا ہے۔ اگر وہ یہ خیال کرے کہ میں حالتِ وقف میں وقوف کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا میں واقف نہیں ہے اس کے دماغ میں خدا کا تصور نہیں ہے بلکہ وقفہ (غیر خدا) کا تصور ہے اور یہ تصور منافیٔ وقوف ہے۔

(۱۵) وقفے میں نہ تثبت (ثبوت) ہے نہ محو ہے۔ نہ قول ہے نہ فعل ہے، نہ علم ہے نہ جہل ہے (وقفہ مقولۂ کیف وکم سے وراء ہے)

(۱۶) وقفہ از قبیل صمدیت ہے جو صاحبِ وقفہ ہے۔ اس کا ظاہر اس کا باطن ہے اور اس کا باطن اس کا ظاہر ہے (یعنی واقف میں دوئی باقی نہیں رہتی)

(۱۷) ثنایان دیومیت (استعلال) صرف واقف کو حاصل ہوتی ہے اور وقفہ صرف دائم ہی کی شان ہے۔ (ہر واقف دائم ہوتا ہے اور ہر دائم واقف ہوتا ہے)

(۱۸) وقفے کو ہر علم کا ادراک ہوتا ہے (واقف ہر علم پر مطلع ہوتا ہے) لیکن کسی علم کو واقف یا وقفے کی اطلاع نہیں ہو سکتی۔

(۱۹) جو مجھ میں یا میرے ساتھ وقوف نہیں کرتا تو وہ میرے علاوہ ہر شے میں وقوف کرتا ہے (غیر اللہ میں گرفتار رہتا ہے اور تمام اہل دنیا غیر اللہ ہی میں سرگرداں رہتے ہیں)

(۲۰) واقف ہمیشہ اوا خر پر نظر رکھتا ہے اوائل کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہو سکتی (وہ یہ نہیں دیکھتا کہ میری ابتدا کیسے ہوئی بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ میرا انجام کیا ہوگا)[2]

(۲۱) وقفہ واقف کو دنیا اور عقبیٰ دونوں کی غلامی سے آزاد کر دیتا ہے۔

(۲۲) صلوٰۃ واقف پر فخر کرتی ہے جس طرح مسافر صلوٰۃ پر فخر کرتا ہے۔

(۲۳) کوئی شے میری معرفت حاصل نہیں کر سکتی اگر کسی حد تک ہو سکتی ہے تو واقف کو۔

(۲۴) واقف حکم بشریت سے قریب قریب بالاتر ہو جاتا ہے۔

(۲۵) وقفے میں ہر شے کی قدر ساقط ہو جاتی ہے۔ نہ وقفہ کسی شے سے متعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی شے وقفے

---

[1] اقبال نے اسی نکتے کو یوں بیان کیا ہے:-

وہی اصل مکاں و لامکاں ہے — مکاں کیا شے ہے؟ انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے؟ کیا بتائے؟ — اگر ماہی کہے: دریا کہاں ہے؟

[2] خودمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے — کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے (اقبال)

سے کوئی علاقہ رکھتی ہے۔

(۲۶) وقفے میں واقف کو اس شئے سے تسلی ملتی ہے جس کے لئے اس نے وقوف کیا ہے اور اس شئے کا بدل ملتا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے وقوف کیا ہے (واقف کو ذاتِ باری سے تسلی ملتی ہے اور غیر اللہ سے مفارقت کا نعم البدل مل جاتا ہے)

(۲۷) وقفہ رویتِ باری کا دروازہ ہے جو حالتِ وقفہ میں ہے مجھے دیکھ سکتا ہے اور جو مجھے دیکھ لیتا ہے، واقف ہو جاتا ہے مگر جو مجھے نہیں دیکھ سکتا واقف بھی نہیں ہو سکتا۔

(۲۸) واقف نعماء سے متلذذ ہوتا ہے مگر نہیں ہوتا اور ابتلاؤں سے متالم ہوتا ہے مگر نہیں ہوتا (نفری کی عبارت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "واقف نعیم میں سے کھاتا ہے مگر نہیں کھاتا اور ابتلا میں سے پیتا ہے مگر نہیں پیتا"۔ میں نے مطلب لکھ دیا ہے کہ اس کی نظر میں نعمت اور ابتلا یا خوشی اور غم دونوں یکساں ہو جاتے ہیں")

(۲۹) میں نے واقف کے مشاہدے کو اپنی عصمت کی عصمت سے ممزوج (وابستہ) کر دیا ہے اس لئے وہ ہر شئے سے نفور ہوتا ہے اور کوئی شئے اس سے موافقت نہیں کر سکتی۔

(۳۰) اگر واقف کا دل سوی (غیر اللہ) میں ہوگا تو وہ واقف نہیں ہو سکتا اور اگر سوی (غیر) اس کے دل میں ہوگا تو وہ ثابت (مستقل) نہیں ہو سکتا۔

(۳۱) واقف، کلی علم اور کلی حکم ہوتا ہے اور صرف واقف ہی ان دونوں کو اپنی ذات میں جمع کر سکتا ہے۔

(۳۲) واقف کی نظر میں علما مستند نہیں ہیں اور علما کی نظر میں واقف مستند نہیں ہوتا۔

(۳۳) واقف مخلوقات کے قرب سے بعید ہوتا ہے اور ان کے علوم سے محتجب ہوتا ہے۔

(۳۴) اگر تو نے میرے ساتھ وقف (وقوف) کیا ہے تو غیر تیرے لئے حرام ہے اس میں داخل نہ ہونا۔ اگر تو ایسا کرے گا تو مجھ سے دور ہو جائے گا۔

(۳۵) واقف مومن (امین یا معتمد) ہوتا ہے اور مؤتمن مختزن (صاحب خزانہ) ہوتا ہے۔

(۳۶) میرے وسیلے سے وقوف کر لیکن وقفے کے ذریعے سے میرا مقابلہ (سامنا) مت کر کیونکہ اگر میں اپنی ثنا، جو میری طرف راجع ہے تجھ پر ظاہر کر دوں اور اپنا علم جو میرے علاوہ کسی کے شایان نہیں ہے تجھ پر واضح کر دوں تو کونیت (کیفیت ہستی) اولیت کی طرف لوٹ جائے گی، وہ اولیت دیمومیت (ہمیشگی) کی جانب رجوع کرے گی اور نہ اس کا علم اس سے جدا ہو سکے گا اور نہ اس علم کا معلوم اس کے علم سے غائب ہو سکے گا۔ پھر تو مجھے دیکھ لے گا گویا تو الحق کو دیکھ لے گا جس میں کوئی وقوف نہیں ہے پھر تجھے اس کی معرفت حاصل ہو جائے گی اور کوئی سیرنہ ہوگی جسے تو طے (عبور) کر سکے۔

(۳۷) واقف علم کا مشاہدہ کرتا ہے کہ وہ کس طرح معلوم کو ضائع (فنا) کر دیتا ہے وہ کسی موجود شے سے منقسم نہیں ہوتا اور مشہود کی طرف منعطف (مائل) نہیں ہوتا۔

(۳۸) جو واقف نہیں ہے وہ معلوم کو تو دیکھ سکتا ہے مگر علم کو نہیں دیکھ سکتا اور بیداری اور غفلت دونوں اس کے لئے حجاب بن جاتی ہیں۔

(۳۹) حسن واقف کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتا اور روع (خوف) اسے خوفزدہ نہیں کر سکتا۔ میں اس کے لئے کافی ہوں (وہ مجھی سے محبت کرتا ہے اور مجھی سے ڈرتا ہے) اور وقفہ اس کی حد ہے۔

(۴۰) اگر میں اپنے آپ کو اس سے اس شے میں پوشیدہ کر لوں جس کی شہادت کوئی شاہد دیتا ہے تو وہ میرے فقدان کے ضرر کی تو شکایت کرتا ہے مگر شاہد کے ضرر کی شکایت نہیں کرتا۔

(۴۱) ہر شے واقف کے سامنے مبہوت ہو جاتی ہے اور واقف صمود احدیت کے سامنے مبہوت ہو جاتا ہے۔

(۴۲) وقفہ معرفت کی روح ہے اور معرفت علم کی روح ہے اور علم حیات کی روح ہے۔

(۴۳) ہر واقف عارف بھی ہوتا ہے مگر کوئی عارف واقف نہیں ہوتا۔

(۴۴) تمام واقفین میرے اہل ہیں اور تمام عارفین میری معرفت کے اہل ہیں۔

(۴۵) میرے اہل امراء ہیں اور اہل معرفت وزراء ہیں۔

(۴۶) وقفے کے لئے وہ علم ہے جو وقفہ نہیں ہے اور معرفت کے لئے وہ علم ہے جو معرفت نہیں ہے۔

(۴۷) واقف کا جسم تو مر سکتا ہے مگر اس کا قلب نہیں مر سکتا۔

(۴۸) مدعی (منافق) ہر شے میں داخل ہوتا ہے اور دعوے (نفاق) کے ساتھ اس میں سے باہر نکل آتا ہے اور خبر دیتا ہے (اعلان کرتا ہے) کہ میں اس میں داخل ہو چکا ہوں لیکن اس میں وقفہ نہیں کیا (مگر سچی بات یہ ہے کہ) وہ نہ داخل ہوا نہ ہو سکے گا، نہ اس نے اس کی خبر دی ہے نہ دے سکے گا۔

(۴۹) اگر وقفے (کی حالت) میں تو کسی سہارے پر ہو گا تو اس سہارے کے بارے میں میرے مکر سے ڈرتا رہ (میں اسی کو فنا کر دوں گا)

(۵۰) وقفہ اپنے ماسوی کی نفی کر دیتا ہے جس طرح علم جہالت کی نفی کر دیتا ہے۔

(۵۱) تو واقف سے جو شے بھی طلب کرے گا حاصل کر لے گا۔ لیکن تو واقف کو کسی شے میں تلاش کرے گا تو حاصل نہ کر سکے گا (واقف کے پاس ہر شے ہے مگر واقف کسی شے میں نہیں ہے)

(۵۲) صبر وقفے کے علاوہ ہر شے سے بالاتر (افضل) ہے صرف وقفہ صبر سے افضل ہے۔

(۵۳) جب بلا (آزمائش) نزول کرتی ہے تو واقف کے قریب سے ہو کر گذر جاتی ہے لیکن عارف کی معرفت

اور عالم کے علم پہ نازل ہو جاتی ہے۔

(۵۴) واقفت ائتلاف (موافقت) سے اسی طرح باہر نکل آتا ہے جس طرح اختلاف سے۔

(۵۵) وقفہ میرا بیدِ طامس (مٹانے والا ہاتھ) ہے وہ جس شے پہ آتا ہے اسے مٹا دیتا ہے اور جو شے اس کا ارادہ کرتی ہے (اس کی طالب ہوتی ہے) اسے سوختہ کر دیتا ہے۔

(۵۶) جو کسی شے کے علم سے آگاہ ہے تو اس کا علم اس شے سے تعرض کرنے کا اعلان (ایذان) ہے۔

(۵۷) وقفہ میرا جوار (قرب) ہے لیکن میں قرب کا غیر ہوں۔

(۵۸) عارف کسی واقف کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

(۵۹) وقفہ معرفت کے لئے بمنزلہ عمود (ستون) ہے اور معرفت علم کے حق میں ستون ہے۔

(۶۰) وقفہ کسی سبب (علت) سے متعلق نہیں ہوتا اور نہ سبب اُس سے متعلق ہوتا ہے۔

(۶۱) اگر کائنات میں کوئی شے میری شایانِ شان (میری پسند کے قابل) ہو سکتی ہے تو وہ وقفہ ہے اور اگر کوئی شے میرے متعلق خبر دے سکتی ہے تو وہ بھی وقفہ ہی ہے۔

(۶۲) جس معرفت میں وقفہ نہ ہو وہ جہل کی طرف راجع ہو جاتی ہے۔

(۶۳) وقفہ میری ریح ہے وہ جسے اٹھالے مجھ تک پہنچ جاتا ہے اور جسے وہ نہیں اٹھاتی وہ اپنے آپ تک پہنچ جاتا ہے (مجھ تک نہیں پہنچتا)

(۶۴) میں تو صرف اس قدر کہتا ہوں "اے واقف! وقف کر اور اے عارف! معرفت حاصل کر"

(۶۵) علم معرفت کی طرف رہنما نہیں ہو سکتا اور معرفت وقفے کی طرف رہنما نہیں ہو سکتی اور وقفہ میری طرف رہنما نہیں ہو سکتا۔

(۶۶) عالم غلام ہے، عارف مکاتب ہے، واقف حُرّ (آزاد) ہے۔

(۶۷) واقف فرد (مجرد) ہوتا ہے۔ عارف مزدوج ہوتا ہے۔

(۶۸) عارف عالم بھی ہے معلوم بھی ہے مگر واقف عالم ہے معلوم نہیں ہے۔

(۶۹) واقف علم، عمل اور معرفت تینوں کا وارث ہوتا ہے مگر اس کا وارث اللہ کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔

(۷۰) علم معرفت میں سوخت فنا ہو جاتا ہے اور معرفت وقفے میں سوختہ ہو جاتی ہے۔

(۷۱) واقف کے علاوہ ہر شخص کے پاس ساز و سامان ہوتا ہے اور ہر ساز و سامان والا مہزوم (شکست خوردہ) ہوتا ہے[1]

---

[1] خوشش آں راہی کہ سامانے ندارد

(۷۲) وقفہ ایک تعین سرمدی ہے جس میں کوئی ظن (رائے یا قیاس) نہیں پا سکتا۔

(۷۳) عارف واقف کے بارے میں شک کر سکتا ہے مگر واقف کو عارف کے متعلق کوئی شک نہیں ہوتا۔ (واقف شک سے بالاتر ہوتا ہے اُسے یقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے)

(۷۴) وقفے میں کوئی واقف (موجود) نہیں ہوتا وگرنہ وہ وقفہ نہیں ہے اسی طرح معرفت کوئی عارف نہیں ہوتا ورنہ وہ معرفت نہیں ہے۔

(۷۵) جو واقف نہیں اس کی معرفت بھی بالغہ (واصل الی الحق) نہیں ہے اور جسے معرفت حاصل نہ ہو، اس کا علم اسے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔

(۷۶) عالم اپنے علم کو تو دیکھتا ہے مگر معرفت کو نہیں دیکھ سکتا اور عارف اپنی معرفت کو دیکھتا ہے مگر مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ واقف مجھے دیکھتا ہے اور (مجھے دیکھنے کے بعد) کسی کو (ماسوی کو) نہیں دیکھتا۔

(۷۷) وقفہ میرا علم ہے جو واقف کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ لیکن جو میرے علم کی مخالفت کرے، اسے کوئی پناہ نہیں مل سکتی (الوقفة علمی الذی یجیر ولا یجار علیه)

(۷۸) وقفہ ہر عارف کے ساتھ میرا میثاق ہے خواہ اسے اس کا علم ہو یا نہ ہو پس اسے اس کا علم ہو گیا تو وہ معرفت سے نکل گیا اور وقفے میں داخل ہو گیا۔ اگر اس کا علم نہ ہو سکا تو اس کی معرفت اس کی حد سے ممتزج (وابستہ) ہو جاتی ہے۔

(۷۹) وقفہ میرا نور ہے (جس کے ساتھ تاریکی نہیں رہ سکتی) تاریکی اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی۔

(۸۰) وقفہ صمود[1] ہے اور صمود دیومیت ہے اور دیومیت کے ساتھ حدوث قائم نہیں ہو سکتا۔

(۸۱) حقیقت کو واقف کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا (اس کا ادراک نہیں کر سکتا)

(۸۲) وقفہ قرب و بُعد سے وراء ہے۔ معرفت قرب میں ہے اور قرب بُعد سے وراء ہے۔ علم بُعد میں ہے اور وہی اس کی حد ہے۔

(۸۳) عارف اپنے علم کی حد دیکھتا ہے مگر واقف حد سے وراء ہوتا ہے۔

(۸۴) واقف، معارف کی نفی کر دیتا ہے جس طرح خواطر (خیالات) کی نفی کر دیتا ہے۔

(۸۵) اگر کوئی شے حد سے منفصل ہو سکتی ہے تو وہ واقف ہے۔

---

[1] صمود یا صمدیت اللہ کی صفت ہے (اللہ الصمد) صمد کے لفظی معنی ٹھوس کے ہیں جس میں کوئی شے داخل نہ ہو سکے۔

(۸۶) علم نہ معرفت کا متحمل ہو سکتا ہے نہ اس پر ظاہر ہو سکتا ہے اور معرفت وقف کی متحمل ہو سکتی ہے۔ نہ اس پر ظاہر ہو سکتی ہے۔

(۸۷) عالم اپنے علم کی خبر دیتا ہے، عارف اپنی معرفت کی خبر دیتا ہے اور واقف میری خبر دیتا ہے۔

(۸۸) عالم اوامر و نواہی کی خبر دے سکتا ہے اور اس کا علم انہی میں منحصر ہے۔ عارف میری صفات کی خبر دیتا ہے اور اس کی معرفت انہی سے متعلق ہے لیکن واقف میری خبر دیتا ہے اور مجھی میں اس کا وقف (قیام) منحصر ہے۔

(۸۹) میں ہر شے سے اس کی ذات (اس کے نفس) سے بھی زیادہ قریب ہوں اور واقف ہر شے کے مقابلے میں مجھ سے قریب تر ہے۔

(۹۰) اگر عالم میرے بُعد کی رویت سے خارج ہو جاتے تو جل جاتے اور اگر عارف میرے قرب کی رویت سے خارج ہو جاتے تو جل جاتے اور اگر عارف میری رویت سے خارج ہو تو جل جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عالم کو میرا قرب حاصل ہو جائے تو وہ اس کیفیت کا متحمل نہ ہو سکے گا فنا ہو جائے گا اور عارف میرے قرب سے محروم ہو جائے تو وہ اس کیفیت کا تحمل نہ کر سکے گا فنا ہو جائے گا اور اگر واقف مجھ سے جدا ہو جائے تو وہ میری جدائی کی تاب نہ لا سکے گا اور آتشِ فراق میں جل کر ختم ہو جائے گا۔

(۹۱) جو کچھ عارف دیکھتا ہے واقف بھی اسے دیکھ سکتا ہے اور اسے اس کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے اسی طرح جو کچھ عالم دیکھتا ہے عارف بھی دیکھ سکتا ہے اور اسے اس کا علم بھی حاصل ہوتا ہے۔

(۹۲) علم میرا حجاب ہے، معرفت میرا کلام ہے، وقف میرا حضور ہے۔

(۹۳) واقف تغیر سے متاثر نہیں ہو سکتا اور آرزوئیں اسے متحرک نہیں کر سکتیں۔

(۹۴) واقف کی حکومت اس کی خاموشی ہے۔ عارف کی حکومت اس کا نطق ہے اور عالم کی حکومت اس کا علم ہے۔

(۹۵) وقف قیل و قال سے وراء ہے (بذریعہ الفاظ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی) اور معرفت قیل و قال کی انتہا ہے۔

(۹۶) وقف میں ہر فرق (امتیاز) غرق ہو سکتا ہے۔

(۹۷) واقف کا قلب میرے قبضے میں ہے، عارف کا قلب اس کی معرفت کے قبضے میں ہے۔

(۹۸) عارف صاحب قلب ہوتا ہے، واقف صاحب رب ہوتا ہے۔

(۹۹) واقف صفتِ کون (ہستی) سے عبور کر جاتا ہے۔ ہستی کو اس پر قدرت نہیں ہے۔

(۱۰۰) واقف کسی شے میں قرار نہیں پکڑتا۔ عارف فقدان شے میں قرار نہیں پکڑتا۔

(۱۰۱) واقف کون (عالم رنگ و بو) میں قرار نہیں پکڑتا اور نہ کوئی شے یا ہستی اس میں قرار پکڑ سکتی ہے۔

(۱۰۲) سب چیزیں میری (ملک) ہیں اور جو شے میری ہے وہ اُن اشیا میں سے ہے جن کا وقفہ (قیام) میری ملک ہے۔ (میں الحی اور القیوم ہوں)

(۱۰۳) وقفہ عالم مشہود کے لئے بمنزلہ آگ ہے اور معرفت اس کے حق میں بمنزلہ نور ہے (کائنات میرے جلوے کی تاب نہیں لا سکتی۔ اگر میں متجلی ہو جاؤں تو ساری کائنات اسی طرح جل کر خاک ہو جائے گی جس طرح کوہِ طور ریزہ ریزہ ہو گیا تھا)

(۱۰۴) وقفہ مجھی کو دیکھتا ہے۔ ہاں عارف مجھے اور اپنے آپ دونوں کو دیکھتا ہے (وقفے میں من و تو کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے[1])

(۱۰۵) وقفہ وقفے کا وقفہ ہے، معرفت کی معرفت ہے، معرفت کا علم ہے۔ علم کی معرفت ہے نہ معرفت ہے نہ وقفہ۔

(۱۰۶) عارفوں کے لئے معرفت میری خبریں ہیں مگر واقفوں کے لئے میرا چہرہ ہے (یہ لفظی ترجمہ ہے مطلب یہ ہے کہ عارفوں کی رسائی میری صفات تک ہے۔ واقفوں کی رسائی میری ذات تک ہے)

مخاطبہ پنجاہ و ششم

یا عبد من شهدنی رأی کبریائی من الآیات تخشع لی وهی
غیر بادیات وتخضع لسلطانی وهی غیر مستطانة، هنالک اذا
وقفت فی یوم الجمع صحبتہ فی الاحوال کما صحبنی من وراء الاستار
وارسلتہ الیہ ثبتاً فی الزلزال، فثبت بی علی کل حال

(۱) اے بندے! جو میرا مشاہدہ کرتا ہے وہ منجملہ آیات میری عظمت و کبریا کو دیکھتا ہے اور میرے سامنے خشوع (فروتنی) کا اظہار کرتا ہے اور وہ (آیات) ظاہر نہیں ہیں اور میری قدرت کے سامنے خضوع (عاجزی) کا اظہار کرتا ہے اور وہ میری صاحبِ قدرت نہیں ہیں۔ یہاں جب وہ یوم جمع میں وقوف کرتا ہے تو میں اس کے احوال (ہول یا خوف) میں اس کا ساتھی ہوتا ہوں جس طرح وہ حجابات سے ورا ہو کر میرا ساتھی ہوتا ہے اور

---

[1] مرشد رومیؒ، عارف جامیؒ اور صوفیائے مابعد سب نفری ہی کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ رومیؒ نے اس شعر میں نفری ہی کے مسلک کو واضح کیا ہے :-

من و تو بے من و تو جمع شوند از سر ذوق
خوش و فارغ ز خیالاتِ پریشاں، من و تو (دیوان شمس تبریز)

قدم ڈگمگانے کے وقت میں اسے ثبات عطا کرتا ہوں۔ پس میری بدولت وہ ہر حالت میں ثابت اور قائم رہتا ہے۔

(۲) جو شخص بھی میری عطا کردہ نعمتوں کو اپنے نفس کے کفر سے محفوظ رکھتا ہے اور میرے معارف کو اپنے جہل کے میلان سے محفوظ رکھتا ہے اور میرے ذکر کو، جب وہ میرا ذکر کرتا ہے، اپنی طبیعت کے غلبے سے محفوظ رکھتا ہے وہ اپنی نجات کے لئے مجھ سے عہد حاصل کر لیتا ہے اور کل (بروز قیامت) میرے پاس نہایت معزز مقام میں ہوگا

(۳) جو شخص میرے حجل (فعل تخلیق یا حکم) سے دور ہو جائے بغیر اس بات کے کہ وہ (میرا حکم) اسے دور کرے تو وہ شخص مجھ سے متصل تو ہو سکتا ہے مگر واصل نہیں ہو سکتا۔

(۴) دوری مرتفع نہیں ہو سکتی جب تک اجل (نمرہ) مرتفع نہ ہو جائے اور نمرہ مرتفع (دور) نہیں ہو سکتا جب تک غیبت مرتفع نہ ہو جائے۔

(۵) جو میرا مشاہدہ نہیں کر سکتا اسے[1] اس کا علم کوئی نفع نہیں دے سکتا اور نہ وہ دائرہ جہالت سے باہر نکل سکتا ہے (نہ اس کی جہالت کا ازالہ ہو سکتا ہے)

(۶) مت خواہش کر کہ ملائمت (موافقت) یا منافات (مخالفت یا اختلاف) کے ذریعے سے تو محتجب (مجھ سے دور) ہو جائے کیونکہ کوئی شئے نہ تجھے مجھ سے محتجب کر سکتی ہے نہ واصل کر سکتی ہے۔ در اصل میں ہی حاجب (موجب حجاب) اور میں ہی موصل (باعث وصال) ہوں۔ وصف اور صفت یہ طریقے ہیں اُن اشیا کی شان مجعولیت ہیں جن کو میں نے ظاہر کیا ہے وہ اُن سے واصل ہو گیا جو اُن کے ذریعے سے جوڑتا ہے اور جو ان کے ذریعے سے محجوب ہوتا ہے وہ اُن سے محجوب نہیں ہوتا۔

(۷) جو میرے ذریعے سے میری معرفت حاصل کرتا ہے تو اسے ایسی پختہ اور کامل معرفت حاصل ہو جاتی ہے کہ پھر وہ شخص ابد تک میرا منکر نہیں ہو سکتا۔

(۸) اگر میں تیرے لئے اپنی یاد کے دریچوں میں سے کوئی دریچہ کھول دوں جو تیری ہر ضرورت کے لئے کافی ہوگا اور ہر حال میں تیرے ساتھ رہے گا تو پھر تجھے دنیا میں کسی شئے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ جس طرح اُس شخص کو ہر وقت ہر شئے کی ضرورت رہتی ہے جو اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے (اپنی ذات کو اپنی ضروریات کے لئے کافی سمجھتا ہے) اور تو کسی شئے میں طمانیت حاصل نہیں کرے گا جس طرح وہ شخص حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو مستغنی سمجھتا ہے۔

(۹) (اے بندے) میرا ذکر تیرے حق میں میری ذات کے انکشاف کا سبب ہو جائے گا اور فاتحہ (آغاز) ذکر یہی معرفت ہے۔

---

[1] راقم الحروف کی پوری زندگی اس قول کی صداقت پر شاہد عدل ہے

(۱۰) جب تک میں خود اپنے کو کسی پر ظاہر نہ کروں وہ مجھے نہیں جان سکتا۔ اور جو مجھے جانتا نہیں، میں اس کی بات سنتا بھی نہیں۔

(۱۱) جب تو یہ دیکھے کہ میں سویٰ (غیراللہ) کو تجھ سے ہٹا رہا ہوں لیکن تجھے اس سے نہیں ہٹا رہا ہوں تو مجھ سے عالم اور جاہل کا سوال کر اور امن و خطر کے ذریعے سے مجھ تک پہنچ جا۔

(۱۲) جب تو یہ دیکھے کہ میں تجھے سویٰ (غیراللہ) سے ہٹا رہا ہوں مگر سویٰ کو تجھ سے نہیں ہٹاتا تو میری آزمائش سے بچ کر میری پناہ میں آجا اور میری خفیہ تدبیر سے بچنے کے لئے مجھی سے استخارہ کر۔

(۱۳) بندوں سے کہہ دے اگر تم خدا کو قابض اور باسط (سکڑتے اور پھیلتے) دیکھ لیتے تو اپنے انساب (خاندانی شجروں) سے بری (بے تعلق) ہو جاتے اور اپنے احساب (خاندانی حالات) سے عاری ہو جاتے۔

(۱۴) آگاہ ہو جاؤ کہ قسم ہے مجھے اپنی فردانیت کی عزت کی اور قسم ہے مجھے اپنی عزت (عظمت) کی فردانیت کی کہ میں قابض نہیں ہوں مگر باسط ہوں اور باسط نہیں ہوں مگر قابض ہوں اگر میں بواسطہ خویشں باسط ہوتا تو تو میرا عبد (غلام) نہ ہوتا اور اگر میں بواسطہ خویشں قابض ہوتا تو تو میرا عارف نہ ہوتا۔

(۱۵) بندوں سے کہہ دے کہ اے لوگو! اگر تم کو اس کی معرفت حاصل ہوتی تو تم کبھی اس کا انکار نہ کرتے اگر تم غیراللہ کا انکار کر دو تو اس کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔

(۱۶) جب میں کسی واسطے سے کسی کو اپنی معرفت میں قائم کرتا ہوں تو اسے اسی واسطے معرفت کی حقیقت سے محو کر دیتا ہوں۔ تب وہ انتہا کو جان لیتا ہے اور اپنے اقرار کے مطابق مجھ میں قائم ہو جاتا ہے اور اپنے تحقق کے مطابق غیر کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔

(۱۷) وہ لطف جو سویٰ اور لاسویٰ (غیر و لاغیر) کو ثابت (قائم) کرتا ہے لطف کی مانند نہیں ہے اور وہ عزت جو سویٰ کو فنا کر دیتی ہے، عزت کی طرح نہیں ہے۔

(۱۸) اگر میں تجھے گویائی عطا کروں تو حکمت کی خاطر ایسا کروں گا۔ اور اگر میں تجھے صامت کر دوں تو یہ اس لئے کہ تو عبرت حاصل کرے۔

(۱۹) کوئی شے میری ہمسر نہیں ہے لیکن ہر شے میری ہی بدولت قائم ہے۔

(۲۰) اگر تو علم کو دیکھے اور اس سے اعراض کرے تو گویا تو نے ماسویٰ سے اعراض کیا۔ خواہ وہ رضا ہی کیوں نہ ہو۔

(۲۱) اے عبد! میں الراحم ہوں۔ گناہ گاروں کے گناہ میری رحمت پر سبقت نہیں پا سکتے (میری رحمت ہمیشہ ان کے گناہوں کے آگے رہے گی) اور میں العظیم ہوں۔ میری معرفت پر مجرموں کے جرائم مستولی (مسلط) نہیں ہو سکتے۔

(۲۲) میں المحسن ہوں۔ میرے احسانات منکرین کے انکار سے محجوب نہیں ہو سکتے اور میں المنعم ہوں، میری نعماء غافلوں کی غفلت سے منقطع نہیں ہو سکتی۔

(۲۳) میں المنان ہوں۔ میری کرم نوازی شاکرین کے شکر کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور میں الوہاب ہوں۔ سرکشوں کی سرکشی مجھے بخشش سے باز نہیں رکھ سکتی۔

(۲۴) میں الرؤف ہوں۔ معرضین کا اعراض (گنہ گاروں کا گناہ) میری رافت کو محدود نہیں کر سکتا۔ میں العوّاد بالجمیل (نیکی کے ساتھ فیض رساں) ہوں۔ لاہین کا لہو (بے پروا لوگوں کی بے پروائی) مجھے فیض رسانی سے نہیں روک سکتی۔

(۲۵) میں القریب ہوں۔ عارفوں کے معارف میرے قرب کا عرفان حاصل نہیں کر سکتے اور میں البعید ہوں عالموں کے علوم میرے بُعد کا ادراک نہیں کر سکتے۔

(۲۶) میں القائم ہوں اور میری دیمومیت پر مطلع نہیں ہو سکتا۔ میں الواحد ہوں۔ اعداد مجھ سے مشابہ نہیں ہو سکتے۔

(۲۷) میں الظاہر ہوں لیکن آنکھیں مجھے نہیں دیکھ سکتیں۔ میں الباطن ہوں۔ انسانوں کے ظنون (خیالات، قیاسات، اوہام) میری ذات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

(۲۸) میں الودود ہوں خواہ تو مجھ سے اپنا منہ پھیرلے مگر میں تجھ سے اپنا منہ نہیں موڑوں گا۔ میں الغفور ہوں۔ میرا عفو تیرے اعتذار (عذر) کا منتظر نہیں رہتا۔

(۲۹) میں الوہاب ہوں۔ میں جو کچھ کسی کو عطا کر دیتا ہوں پھر اس سے واپس نہیں لیتا۔ میں المنیل ہوں۔ میں جو کچھ کسی کو پہنچا دیتا ہوں پھر اُسے اس سے طلب نہیں کرتا۔

(۳۰) میں المدیل ہوں۔ میں جو کچھ کسی کی طرف منتقل کر دوں اسے دوسرا اپنی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ میں المزیل ہوں میں جسے زائل کر دوں وہ مستقیم یا مستقر نہیں ہو سکتا۔

(۳۱) میں المجیل ہوں جسے میں پلٹ دوں وہ سابقہ حالت پر ثابت نہیں رہ سکتا اور میں المہیل ہوں، جسے میں خوفزدہ کر دوں اسے کوئی اطمینان نہیں دے سکتا۔

(۳۲) میں المیمل ہوں، جسے میں اس کی جگہ سے ہلا دوں اسے کوئی اس جگہ قائم نہیں کر سکتا۔ میں المقیل ہوں، جسے میں اٹھا کر کھڑا کر دوں اسے کوئی گرا (پچھاڑ) نہیں سکتا۔

(۳۳) ہر شے سے وہی چیز طلب کی جاتی ہے جو اس میں ہے۔ میں الفرد المنفرد ہوں اس لئے میں کسی شے میں سے نہیں ہوں جو کوئی شے مجھے طلب کر سکے اور نہ میں کسی شے کی بنا پر ہوں جو کوئی شے میرے ساتھ متخصص ہو سکے (جیسے میرے ساتھ کوئی خصوصیت حاصل ہو سکے)

خطوط و نکات

پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش کے بارے میں

'میثاق' کے موقف پر تبصرے اور مشورے

(بعض مصالح کے پیش نظر مکتوب نگار حضرات کے نام حذف کئے جا رہے ہیں۔ مدیر)

(۱)

— ہمارے ایک کرم فرما نے ہمارے اب تک کے موقف کی کلّی تائید بایں الفاظ کی ہے کہ :-

"میثاق" کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں۔ گذشتہ شمارہ میں صحت کے بارہ میں اچانک ہی تشویش ناک صورت حال پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ شفا کاملہ سے نوازیں۔ امید کہ صحت بڑی تیزی کے ساتھ بہتر ہو رہی ہوگی۔

دین حق اور اس کی بساط بھر خدمت کے لئے آپ کا جذبہ انتہائی قابل قدر ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ استقامت بخشیں اور نظر بد سے بچائیں۔ آمین۔ ماشاءاللہ آپ کا فکر بڑا واضح اور حالاتِ حاضرہ پر آپ کا نقطہ نظر بہت صائب ہے۔ پڑھ کر مسرت ہوتی ہے۔ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ موجودہ پیچ پیچ دور میں آپ ...... صاحب اور ...... صاحب کی طرح پھسلے نہیں بلکہ اپنے زاویہ نگاہ کو حقیقت پسندانہ اور علماء حقانی کے قریب تر رکھا ....."

— اور پھر اس مشورے سے نوازا ہے کہ :-

"آپ سے درخواست ہے کہ از راہ کرم "نقض غزل" کا سلسلہ ضرور مکمل کیجئے۔ بہت ہی مفید اقساط آئی تھیں مگر نہ جانے کون بزرگ یا بزرگان آڑے آئے کہ وہ مفید سلسلہ منقطع کرا دیا۔ اسی طرح کسی صاحب یا صاحبان نے ...... صاحب کو خراب کیا ہے۔ جب بھی انہوں نے "مودودیت" کی وضاحت کے لئے قلم اٹھایا۔ دو تین قسطوں کے بعد ہی کسی "غیبی ہاتھ" کی کرم فرمائی کام کر گئی۔ آپ ایسے واقفان حال اس فرض سے اُس وقت تک سبکدوش نہیں ہو سکتے جب تک اس فتنہ اور اس گمراہی کو پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ دو اور دو چار کی طرح واضح نہیں کر دیں گے۔

بلاشبہ وطن عزیز اور دین حنیف کے لئے مرزائیت سے بھی بڑا فتنہ مودودیت ہے۔ اہل ایمان کو اس طرف پوری فکرمندی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

(واضح رہے کہ مکتوب نگار جماعت اسلامی کے سابق رکن اور پرجوش مذہبی جذبات رکھنے والے نوجوان ہیں)

(۲)

ایک دوسرے نوجوان ساتھی کی رائے یہ ہے کہ :-

"آپ کے والا نامہ سے یہ بہت خوشی ہوئی کہ آپ کسی صورت میں بھی موجودہ ملکی خلفشار (جو سیاسی ہے لیکن جسے مذہبی سمجھا جا رہا ہے اور اسلام کو خواہ مخواہ گھسیٹا جا رہا ہے اور اس طرح اسے مزید رسوا کرنے کی چالیں چلی جا رہی ہیں) میں حصہ نہیں لینا چاہتے۔ لیکن ایک نظریہ بھی ہے کہ اسلامی آئین کے نفاذ کا اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہیں آئے گا۔ اس کے بارے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ حل کی ایک صورت یہ ہے کہ تمام دینی جماعتیں (خواہ کسی فرقے سے تعلق رکھتی ہوں) خالص اسلام کے نام پر مشترکہ الیکشن لڑیں تاکہ کسی نہ کسی طرح دیندار لوگ آگے آجائیں خواہ وہ اقلیت میں ہی کیوں نہ ہوں۔"

(۳)

اس سے ذرا آگے کی رائے ایک اور نوجوان کی ہے ہم ان کے خط کو پورے کا پورا من وعن شائع کر رہے ہیں تاکہ اس صالح نوجوان کی ذہنی وجذباتی کیفیت کی پوری عکاسی ہوسکے ——— واضح رہے کہ یہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے دینی جذبہ وافر مقدار میں عطا فرمایا ہے۔

"محترم ڈاکٹر صاحب السلام علیکم۔

امید ہے اب آپ مکمل طور پر صحت یاب ہوں گے اور پہلے کی سی تن دہی کے ساتھ دعوت حق میں مصروف ہوں گے۔ اس روز جب میں کراچی واپس جا رہا تھا وقت کی کمی کے باعث آپ سے ملاقات بہت ہی مختصر رہی۔ میں جلدی میں آپ کے درس کے دوبارہ شروع ہونے پر نہ آپ کو مبارکباد کہہ سکا اور نہ اپنی خوشی کا اظہار کر سکا۔ آپ کے درس میں تعطل کے بعد اس روز پہلی بار مسجد سے آپ کے درس کی آواز آئی تھی۔ میں مصروفیت کے باعث درس میں حاضر تو نہ ہو سکا مگر اس بات پر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ دوبارہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ درس کے سلسلہ کو جاری رکھ سکیں۔ امید رکھتا ہوں کہ یہ سلسلہ اللہ کے فضل وکرم سے بحسن وخوبی قائم رہے گا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو مکمل اور دائمی صحت عطا فرمائے تاکہ آپ اس کار خیر کو

جاری رکھ سکیں۔

نئے سال کا آغاز ہو چکا ہے اور ساتھ ہی سیاسی ہلچل کا بھی۔ خبر نہیں اس ملک میں جمہوریت کا یہ تجربہ بھی کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ آثار تو کچھ اچھے دکھائی نہیں دیتے مگر ہمارے جملہ مسائل فقط جمہوریت سے تو حل نہیں ہو سکتے۔ سوال تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان کا جو خواب دیکھا تھا اور جو ہنوز تشنۂ تعبیر ہے کب پورا ہوتا ہے۔ بظاہر تو سیاسی میدان کا ہر کھلاڑی اسلام کا نام لیوا معلوم ہوتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی نظام کے دعوے داروں کے مابین یہ اس قدر اختلاف کیسا۔ اور ایک ہی نظام کو رائج کرنے کے لئے اتنی پارٹیاں کیا معنی۔ اس صورت حال سے ایک عام آدمی اس کے سوا اور کیا نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اسلام کی حقیقت کو نہیں سمجھتا۔ اور جب وہ لوگ جو عالم کہلاتے ہیں اس کی حقیقت کو نہیں پا سکے تو عام آدمی اس کی گرد کو بھی کیسے پہنچ سکتا ہے۔

یہ صورت حال میرے خیال میں کافی تشویش ناک ہے اور خدشہ ہے کہ اس سے عام آدمی جو اگرچہ اسلام کی تعلیمات سے آگاہ نہیں ہے لیکن اسلام کے نام سے جو کشش اپنے دل میں ابھی تک رکھتا ہے اسے بھی نہ کھو بیٹھے۔ آجکل اسلام کا نام ہر جگہ بلند ہو رہا ہے۔ مسجدوں سے بھی یہی صدائیں آ رہی ہیں کہ سوشلزم کفر ہے اور ہمیں اسلام کے نظام کو اپنانا چاہیئے اور یہ کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ آخر وہ نظام ہے کیا جو اسلام تجویز کرتا ہے لوگ یہ جاننے کے لئے بے تاب ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہے لیکن کہیں کوئی خاکہ سامنے نہیں آتا۔ خبر نہیں سوشلزم اور دیگر باطل نظاموں سے مقابلہ کرنے کے لئے فقط اسلام کا نام کب تک کام آئے گا۔

حال ہی میں جماعت اسلامی نے اپنا MENIFESTO شائع کیا ہے اور دیگر پارٹیاں بھی اپنا اپنا مینی فیسٹو اسلامی نظام کے عنوان سے پیش کر رہی ہیں۔ میں نے ان کا تفصیلی مطالعہ تو نہیں کیا۔ تاہم یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب موجودہ نظام میں چند تبدیلیوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ نیز جماعت اسلامی ۱۹۵۶ء کے آئین کو چند تبدیلیوں کے ساتھ نافذ کرنے کے حق میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ موجودہ نظام میں محض چند تبدیلیوں سے اسلامی انقلاب کیسے رونما ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود موجودہ صورت حال کے پیش نظر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنا بھی قابل ستائش معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس معرکے میں جماعت اسلامی کا کردار اتنا برا معلوم نہیں ہوتا۔ ان کی کوششیں قدرے بارآور ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور لوگوں میں ان کا اثر بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک مقام پر تو

وہ یقیناً بازی جیت چکے ہیں یعنی ۲۹ دسمبر کو پی آئی اے کے انتخابات میں نئی یونین کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی ہے اور عین ممکن ہے کہ جماعت اسلامی کی انتھک کوششوں کی بدولت اگر ہم اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ بھی ہوسکیں تو کم ازکم اس ملک کو بالکل ہی مخالف رُخ پر جانے سے تو روک سکیں۔

اس ساری عرضداشت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کے خیالات سے مستفید ہوسکوں مجھے آپ کی گوناگوں مصروفیات کا احساس ہے لیکن شاید آپ اس ناچیز کے لئے بھی کچھ وقت نکال سکیں۔

والسلام آپ کی دعاؤں کا طالب ......"

(۶)

اور آخری رائے ہمارے ایک محترم بزرگ کی ہے جو خود بھی جماعت اسلامی کے سابق ارکان کے "بے جادہ و بے منزل" قافلے ہی سے تعلق رکھتے ہیں :

"اگرچہ دورِ حاضر کی سیاسی سرگرمیوں سے آپ حضرات بوجوہ الگ تھلگ رہنے کا تہیہ کر رہے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ گذشتہ صدی میں ہمارے متقدمین اور اہل الرائے اس سلسلہ میں الگ تھلگ رہنے کی پالیسی پر گامزن نہیں رہے۔ بنیادی دعوت اور کام کی افادیت سے انکار ممکن نہیں اور یہ کام اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ انہماک سے کیا جائے۔ مگر ملّی حالات اور ملکی سیاسیات کے تقاضے بھی اصحابِ علم و فضل سے اپنا حق مانگتے ہیں ——— اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے مولانا مدنیؒ، مولانا تھانویؒ، مولانا عثمانیؒ اور علامہ اقبال جیسی شخصیتیں سیاست کی پرخار وادی میں کہاں قدم ٹکا سکتی تھیں لیکن حالات نے انہیں جھنجھوڑا اور وہ اپنے وقت میں مجبور ہوئے کہ اس راہ میں بھی اپنا حق ادا کر دیں ——— اگرچہ بین الاقوامی سیاسی تحریکیں اور عالمی بلاک ہماری سیاست پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مگر پاکستان کا بہرحال ایک مستقبل ہے۔ اگر حالات کے دھارے پر بہتے ہوئے جو کنارا آ جائے اسے ہی منزل قرار دینا ہے تو ہمارے لئے غیر جانبداری بڑی ہی مبارک بات ہے۔ لیکن اگر اپنے لئے کوئی کنارا متعین کر کے اسے منزل قرار دینا ہے تو جانبداری حالات کا لازمی تقاضا ہے اور ایسے حالات میں بعض شخصیتوں یا جماعتوں سے طبعی یا حقیقی نفرت اس حد تک آڑے نہیں آنی چاہیئے کہ اپنا وزن ہی اس پلڑے میں جانے لگے جو کسی طرح محمود نہیں اس لئے اس مسئلہ کو بھی سامنے رکھیں۔ بہرحال آپ کی آمد پر انشاء اللہ تفصیلی گفتگو ہوگی۔"

ذاتی تقویٰ و تدین کے علاوہ —— اب تو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں بھی اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج سے تقریباً تین سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ "اب جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کو دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ درست تھی جو کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں۔ فرق باطلہ اور الحاد و اباحیت کو حاصل ہوگا!" لیکن بات یہاں تک نہ پہنچے تو بھی کم از کم اتنا تو ہونا چاہئے کہ اس وقت کی ضدم ضدا میں جو زبانیں ایک دوسرے پر ہو گئی تھیں اب کم از کم ان کا اعادہ تو نہ ہو ——

ہم خود اپنا یہ ذاتی احساس بھی اس مقام پر بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے —— کہ بقیہ تمام معاملات اور قیل و قال ایک طرف کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کے اعتبار سے تو کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ 'پاکستان کی سکیم سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت جو پہلے ہی تہائی ہے وہ تو تین حصوں میں بٹ کر مزید کم ہو جائے گی اور ہندوؤں کی طاقت بالکل یکجا اور مجتمع رہے گی ' —— !!' ان کا خیال کس قدر درست تھا!!

اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان سے مسلمانوں کے کسی تازہ قتل عام کی خبر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا ہدف بنے ہوتے تھے ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولانا کے ساتھ نہایت توہین و تذلیل کا معاملہ کیا —— ان دنوں دار الاسلام سرنا پٹھانکوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کے لئے نہر پہ جایا کرتے تھے (گویا یہ ان دنوں کی مرکز جماعت اسلامی کی شام کی نشست تھی!۔ مدیر) وہاں مولانا مودودی سمیت کچھ لوگوں نے اس خبر پر خوش گپی کے انداز میں تبصرے کرنے شروع کئے۔ لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ —— 'میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنی رح ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!' —— اس پر پوری مجلس پر خاموشی سی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا کہ "مولانا آخر جو لوگ قوم کے احساسات و جذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گذرے تو کون سی بڑی بات ہے!" اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے اس فقرے کو دہرا دیا: 'میں اور تو کچھ نہیں جانتا صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنی رح ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!'"

آتی ہے دوسرے لاکھوں اور کروڑوں حساس مسلمانوں کی طرح راقم الحروف کے دل پہ بھی چھریاں چل جاتی ہیں —— اور نہ صرف یہ کہ یہاں کا سکھ چین کاٹ کھانے کو دوڑنے لگتا ہے بلکہ سیدنا مسیحؑ کی تمثیل کے عین مطابق ہر کھانا ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا گوشت اور ہر مشروب ان کا خون نظر آنے لگتا ہے —— !!

ہمیں دوسروں سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن حیرت ناک افسوس ہوتا ہے حلقۂ دیوبند ہی کے ان اکابر پر جو نہ صرف درس و افتاء بلکہ تلقین و ارشاد کی مسندوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے بھی ایسے کٹھور دل واقع ہوئے ہیں کہ کچھ سیاسی یا روپہلی مصلحتوں کی بنا پر اب بھی ان خادمان دین و ملت پر کانگریسی مولوی ایسی تحقیر آمیز پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے —— !!

رہا سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہونے کا الزام اور اس کی آڑ میں بالواسطہ کفر کا فتویٰ تو جہاں تک جماعتِ اسلامی کا تعلق ہے وہ تو جیسا کہ ہم بعد میں تفصیل سے واضح کریں گے یہ سب کچھ ایک شدید مجبوری اور اضطرار کے تحت حکمتِ عملی کے طور پر کر رہی ہے رہا ہے تھانوی و عثمانی حلقے تو ان کی جانب سے یہ معاملہ کچھ تو ناسمجھی میں ہو رہا ہے اور کچھ غالباً مدنی گروپ کے اُس جرم عظیم کے انتقام کے طور پر جو اس نے جمعیت العلماء کی قیادت سے ان حضرات کو بے دخل کرکے "یوسف بے کارواں" بنا کر کیا تھا —— اس لئے کہ جتنی کچھ سوشلزم کی قائل جمعیت علماء اسلام ہو سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ سوشلزم جماعتِ اسلامی نے بھی حالات سے مجبور ہو کر اپنے منشور میں داخل کر لیا ہے اور تھانوی و عثمانی اکابر کی قیادت میں مختلف مذہبی گروہوں کے ۱۱۸ علماء نے بھی اپنے فتویٰ کے ذریعے اسے سند جواز عطا فرما دیا ہے —— تو ظاہر ہے کہ بنائے نزاع سوشلزم نہیں کچھ اور ہے —— !!

بہرحال معاملہ جمعیت کی طرف سے ان ساری مدافعانہ گذارشات کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود ان کی اپنی بعض باتوں سے نہ صرف یہ کہ ان کی موجودہ قیادت کے وقار کو دھکا لگا ہے بلکہ ان کے اکابر و اسلاف کی شہرت اور نیک نامی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

ان چیزوں میں سے ایک ان کی شدید بدنظمی و بے ترتیبی ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی ہی مضحکہ خیز صورتیں پیش آتی ہیں اور پوری جمعیت تمسخر و استہزاء کا ہدف بنتی ہے۔ چنانچہ ماضی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی معاملے میں جمعیت کے ایک لیڈر کا بیان کچھ اور ہوتا ہے اور کسی دوسری مقتدر ہستی کا بالکل کچھ اور —— اور بالکل وہ کیفیت ہوتی ہے کہ ع

"من چہ می گویم و طنبورۂ من چہ می سرا ید !"

اگر گستاخی شمار نہ ہو تو ہم جمعیت کے اکابر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس سقم کو جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کریں اور تنظیم و جماعت بندی کے کم از کم ناگزیر لوازم کا تو ضرور اپنے یہاں اہتمام کریں۔

دوسری اور اہم تر چیز جمعیت کے اکابر میں سے بعض کی معیارِ شرافت سے گری ہوئی زبان اور ہلکا طرزِ تکلم ہے جس نے حقیقت یہ ہے کہ جمعیت کو خصوصاً شہروں کی پڑھی لکھی مڈل کلاس کے حلقے میں شدید نقصان پہنچایا ہے، ہمیں ان حضرات کے خلوص میں ہرگز کوئی شک نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے جوش، جذبے اور قوتِ کارکردگی پر رشک آتا ہے لیکن ان کے طرزِ خطابت اور اندازِ تکلم پہ گردن کو ندامت سے جھکا لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ کاش کہ یہ حضرات تقریر و خطاب کے دوران "وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" کی قرآنی ہدایات کو پیشِ نظر رکھ سکیں اور یہ اندازہ کر سکیں کہ اس کی خلاف ورزی کر کے وہ خود اپنے مقصد اور مشن کو کس قدر نقصان پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اعوان و انصار کے انتخاب میں ان کے یہاں بھی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی بلکہ جس وقت جو شخص مفید مطلب نظر آئے اسے سر آنکھوں پہ بٹھا لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا ایک نہایت تلخ قسم کا تجربہ انہیں ماضی قریب میں ہو بھی چکا ہے ——— اس کے علاوہ ان کے جلسوں اور جلوسوں میں بعض اوقات بالکل آوارہ اور اوباش لوگ شریک ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے ہر شریف انسان کو ذہنی کوفت بھی ہوتی ہے اور قلبی اذیت بھی۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے "متحدہ اسلامی محاذ" کا توڑ کرنے کے لئے جو "متحدہ دینی محاذ" جمعیت کے زیرِ سرپرستی بنا اس کے جلسے میں نہایت ناگفتہ بہ صورتیں پیش آئیں ——— اور پھر یومِ جہاد کے مشترکہ جلوس میں بھی اس قسم کے عناصر نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس پر بھی ہر شخص نے نفرین و ملامت کی اور اس میں شریک ہونے کی وجہ سے جمعیت کی شہرت کو شدید نقصان پہنچا ——— ہماری ناچیز رائے میں جمعیت کو ہرگز اس طرح کے سہارے تلاش نہیں کرنے چاہئیں، اور جو کام بھی ہو بس اپنی ہی قوت کے

لہ اور یہ تو شاید پرانی باتیں معلوم ہوں ——— تازہ ترین انکشاف یہ ہے کہ اس خط میں جو محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی انتخابی مہم کے دوران بی ڈی ممبروں کو بھیجا اور جسے گویا ان کے چھوٹے سے منشور کی حیثیت حاصل تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے ٹیپ کا بند یہی ارشاد فرمایا تھا کہ :

"... تاکہ ... ہماری آئندہ نسلیں اپنی زندگی اسلامی سوشلزم اور ان اصول و نظریات کے مطابق گزار سکیں جن کی بنیاد پہ ہماری عظیم مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے ...." ع

"چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما !"

بل پر کرنا چاہیے ـــــ اور ہمارا اندازہ ہے کہ غالباً اب جمعیت کے اکابر نے کم از کم اس معاملے میں تو اپنی روش تبدیل کر بھی لی ہے ـــــ چنانچہ حالیہ 'آئین شریعت کانفرنس' کے موقع کے جلوس و جلسوں میں بحمد اللہ ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے پائی۔ بلکہ جلوس تو بلاشبہ اسلامی متانت، سنجیدگی اور وقار کا ایک عظیم شاہکار تھا ـــــ!!

رہی مولانا مودودی کی جماعت اسلامی تو اس کا ماضی اگرچہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں اس لئے کہ اس کا شجرۂ نسب زیادہ سے زیادہ مولانا ابوالکلام مرحوم کے 'الہلال' اور 'البلاغ' سے ملتا ہے یا خیری برادران سے ـــــ اور اگرچہ مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک سے اس کی علیحدگی کے اسباب کے بارے میں بھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے ـــــ تاہم ہمارے نزدیک اس نے جو کام ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کیا وہ درست خطوط پر بھی تھا اور نتیجہ خیز بھی! اور اگر وہ انہی خطوط پر کام کرتی رہتی تو شاید آج اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب "شد پریشاں خواب من ....." کی سی مایوس کن صورت پیش نہ کر رہا ہوتا لیکن افسوس کہ اس کے قائد اعلیٰ نے کچھ وقتی سی ترغیبات (TEMPTATIONS) سے دھوکا کھا کر، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں، خود اپنے بیان کردہ "ایک ہی مخصوص طریق کار" کو ترک کر کے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا ـــــ اور تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کے اُس غبارے میں از سر نو گیس بھرنی شروع کر دی جو قیام پاکستان کے بعد تیزی سے خالی (DEFLATE) ہو رہا تھا۔

پھر چونکہ سیاسی میدان میں داخلے کے لئے ان کے پاس سوائے مذہب کے اور کوئی استناد (CREDENTIALS) سرے سے موجود ہی نہیں تھیں لہٰذا اس میدان کے ہر مقابلے اور حصول اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو انہیں ایک ناگزیر ضرورت کے تحت "اسلام اور کفر" کی جنگ "قرار دینا پڑا ـــــ چنانچہ کم از کم ان کے جرائد و رسائل کے صفحات کی حد تک، پاکستان میں مسلسل تیئیس برس سے اسلام اور کفر کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔

اوّل اوّل اس جنگ میں 'کفر' کی جانب سے لڑنے والی اور اسلام کا راستہ روکنے والی وہ قومی قیادت تھی جس میں خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر ایسے پابند صوم و صلوٰۃ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین ایسے اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے ـــــ جب یہ قیادت کچھ خارجی دباؤ اور کچھ داخلی انتشار کی وجہ سے میدان سے ہٹی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور گمان کیا کہ اب میدان صاف ہے۔ چنانچہ "حکمت عملی" سے کام لیتے ہوئے ۱۹۵۵ء کے سالانہ اجتماع کی قراردادوں کے ذریعے امریکہ کو بھی سفید جھنڈی دکھا دی گئی کہ آپ پریشان نہ ہوں، ہم بھی کوئی غیر نہیں آپ ہی کے نیازمند ہیں ـــــ

لیکن افسوس کہ اس وقت کی اکھاڑ پچھاڑ [illegible] سے بجائے اس کے کہ ان کے لئے کوئی "تیر کی راہ" نکلتی الٹا ۱۹۵۸ء کا مارشل لا اور سابق صدر ایوب خاں کا دس سالہ دور اقتدار برآمد ہوگیا۔ چنانچہ "اسلام اور کفر کی جنگ" کا ایک دوسرا دور شروع ہوگیا۔ اس دور کی ابتدا میں مودودی صاحب نے ایوب خاں کے بھاری پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، کبھی سہروردی مرحوم سے اشتراک کیا، کبھی محترمہ فاطمہ جناح کی قیادت قبول کی۔ الغرض ع "ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دل کی خاطر"! —— لیکن جب یہ پتھر اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہوتا نظر نہ آیا تو تھک ہار کر اپنے قدیم ترین جریدے کے [illegible] اداریے کے ذریعے صلح کی پیشکش کی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا —— لیکن ابھی یہ دوستی صرف گول میز کانفرنس تک ہی پہنچ پائی تھی کہ خود ایوب خاں کا دور اقتدار ختم ہوگیا ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا!

صرف یہی نہیں بلکہ جس چیز کو مسلسل دس سال تک سب سے بڑا شر قرار دیا تھا اور ساری برائیوں کی جڑ اور اسلام کے راستے کی واحد رکاوٹ ٹھیرایا تھا اس کے ہٹتے ہی ایک اور بلا نمودار ہوگئی —— اور ع "شامتِ اعمالِ ما صورتِ بھٹو گرفت!" کا نقشہ نظر آنے لگا۔ علاوہ ازیں ایک طرف معاشرے کے مظلوم و مجبور طبقے یعنی کسان، مزدور، کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازم اور محنت کش ایک طوفان بن کر اٹھتے نظر آئے اور دوسری طرف "بزرگوں کے آوارہ بے کار بیٹے"! گھر کو آنے لگے —— چنانچہ اسلام اور کفر کی جنگ کا ایک نیا معرکہ شروع ہوا —— اور سوشلزم کو کفر کا ایک ہوائی اور فرضی مورچہ قرار دے کر اس پر گولہ باری شروع کر دی گئی[1]

اسلام اور سوشلزم —— یا بالفاظ دیگر اسلام اور کفر کی یہ ہوائی جنگ گذشتہ ایک سال سے ہمارے ملک میں پورے زور و شور سے جاری ہے اور اس میں شک نہیں کہ کچھ سرمایہ داروں کی پشت پناہی اور

[1] اور یہ تو ۲۳ سالہ تاریخ کے صرف ایک پہلو یعنی سیاسی جد و جہد کا سرسری [illegible] ہے ورنہ اس دوران میں جو ستم غریب اسلام پہ ڈھایا گیا جس کے مظاہر عظمیٰ میں سے ایک نظریۂ سنت ہی ہے اور دوسرا صحیفہ "خلافت و ملوکیت" —— اور جو ظلم اپنے پرانے ساتھیوں اور جاں نثاروں پہ روا رکھے گئے جن کی نامکمل روداد ہم نے کبھی "نقض غزل" کے عنوان سے مرتب کی تھی وہ اپنی اپنی جگہ مکمل داستانیں ہیں لیکن ان کے ذکر کا یہاں موقع نہیں!

کچھ دوسرے دینی حلقوں کی امداد نے اس جنگ میں خالص سوشلسٹ عناصر کو پسپائی پر مجبور بھی کر دیا ہے لیکن برا ہو جمعیت علماء اسلام کا ——— کہ وہ اس جیت کو بھی شکست میں تبدیل کرنے پر تل گئی ہے چنانچہ اس نے ایک طرف مزدوروں، کسانوں اور مظلوم و مقہور عوام کی پشت پناہی شروع کر دی ہے اور دوسری طرف جماعت کی امریکہ نوازی، سامراج دوستی اور سرمایہ داروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کا بھانڈہ چوراہے میں پھوڑنا شروع کر دیا ہے ——— !!

تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر جماعت اسلامی کو سب سے زیادہ غصہ جمعیت علماء اسلام ہی پر آئے اور اس کے کارکن اس کے اکابر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپے سے باہر ہو جائیں! اور جمعیت کے لوگ کیوں آپے سے باہر ہو رہے ہیں؟

ہم واضح طور پر عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی کسی حقیقی امید اور واقعی توقع کا تعلق ہے وہ تو ہمیں نہ جماعت اسلامی سے ہے نہ جمعیت علماء سے، اس لئے کہ ان دونوں جماعتوں کا اصل اور حقیقی مزاج سیاسی ہے ——— اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو کام ناگزیر اور لابدّ منہ ہے یعنی ایک ذہنی و فکری انقلاب ——— اور عوام کی اخلاقی و عملی تربیت وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کر رہا۔

لیکن جہاں تک ان دونوں مذہبی گروہوں کی سیاسی حکمت عملی کا تعلق ہے، ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے نزدیک جماعت اسلامی کا یہ مستقل شغل کہ وہ اپنی حصول اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا کر پیش کرتی ہے اسلام کے حق میں نہایت مضر اور اس ملک میں مذہب کے مستقبل کے اعتبار سے سخت خطرناک ہے ——— اس چرواہے کی مانند جو خواہ مخواہ شیر آیا شیر آیا کہہ کر لوگوں کو امداد کے لئے بلا کر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہر وقت اور ہر موقع پر "اسلام خطرے میں!" کے نعرے لگانے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ جب کبھی واقعی شیر آ ہی جائے اور اسلام کو حقیقی خطرہ درپیش ہو تو عوام اسے بھی مذاق سمجھ کر بیٹھے رہ جائیں اور کسی کی غیرت دینی جوش میں نہ آئے! ———

تحریک پاکستان کے دوران بھی "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے بڑے زور شور سے لگے تھے اور اس وقت بھی بہت سے سادہ لوح اور نیک دل مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے ——— لیکن پھر مسلسل ۲۳ سال جس طرح ان نعروں کی مٹی پلید کی گئی اس سے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے لوگوں کے دلوں پر مایوسی اور ناامیدی کے کیسے کیسے اندھیرے چھائے ——— اب پھر اسی "رومانویت" کا دور دورہ ہے لیکن انتخابات کے نتیجے میں جو کچھ ہو گا وہ کیسے

معلوم نہیں، ظاہر ہے کہ "اسلام اور کفر" کی اس ہوائی جنگ کی فتح کے ثمرات کی ساری فصل پرانے، پیشہ ور اور جدی پشتی سیاست دان کاٹیں گے ——— اور ایک بار پھر مذہبی رومانویت کا غبارہ پھٹے گا اور لوگوں میں مایوسی و بد دلی کی عام لہر پھیلے گی ——— اور اس بار اس "DIS-ILLUSIONMENT" کی پوری ذمہ داری جماعت اسلامی پر عاید ہوگی۔

دوسری طرف بحیثیت علماء اسلام کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری رائے میں اس کی موجودہ حکمت عملی آخرکار اسلام کے لئے مفید ثابت ہوگی ——— اس لئے کہ اس وقت اصل صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کچھ لوگوں نے طبقاتی شعور فی الواقع پیدا کر دیا ہے اور کسانوں، مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقات میں یہ احساس بیدار ہو گیا ہے کہ وہ مظلوم و مجبور ہیں اور ان کا استحصال ہوتا رہا ہے ——— چنانچہ وہ اپنے معاشی حقوق کی بازیافت کے لئے منظم جدوجہد کا آغاز کر چکے ہیں ——— اور ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان کو مسلسل ذہنی و فکری غذا بھی دے رہے ہیں اور اس جدوجہد میں ان کے ساتھ تعاون بھی کر رہے ہیں۔ جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوئی تھی اور کسان اور مزدور "قسمت" پر راضی و شاکر تھے بات مختلف تھی لیکن اب صورت حال بالکل تبدیل ہو چکی ہے اور پسے ہوئے طبقات اپنا حق وصول کرنے کے لئے عملاً اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس مرحلے پر "سرمایہ داری" بھی اپنے تحفظ کے لئے ہر ممکن چال چل رہی ہے اور اس کے مدافعانہ ہتھیاروں میں سے ظاہر ہے کہ اہم ترین ہتھیار "مذہب" کا ہے ——— لہٰذا

اگر خدانخواستہ صورت یہ ہوتی کہ ملک کے تمام مذہبی طبقات مجتمع ہو کر سرمایہ داری کے پشت پناہ بن جاتے تو یہ ہمارے نزدیک نہایت خطرناک صورت حال ہوتی اس لئے کہ اس صورت میں عوامی طاقتوں کا سیلاب سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ دین و مذہب کو بھی بہا کر لے جاتا ——— !!

لیکن "جمعیت علماء اسلام" کے اپنے آپ کو غرباء کی صف میں کھڑا کر لینے سے بحمد اللہ یہ خطرہ دور ہو گیا ہے ——— اب انشاء اللہ جنگ اسلام اور کفر کی نہیں رہے گی بلکہ یا سیاسی گروہوں کی باہمی جنگ اقتدار ہوگی یا ایک نظریۂ سیاست و معیشت کا دوسرے نظریۂ سیاست و معیشت سے مقابلہ ہوگا !!

ہم اپنے بارے میں وضاحت سے عرض کئے دیتے ہیں کہ ہمیں اصل دلچسپی صرف اسلام اور اس کی نشاۃ ثانیہ سے ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے اتار چڑھاؤ بھی ہمارے سامنے ہیں، بین الاسلامی اور بین العرب

سیاست کے بارے میں بھی ہمارا ایک نقطۂ نظر ہے اور ملکی سیاست کے پیچ و خم سے بھی ہم بحمد اللہ بالکل نا آشنا نہیں —— لیکن ہم علی وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ ان چیزوں کا فی الوقت اسلام اور اس کی نشاۃ ثانیہ اور دین اور اس کے احیاء سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے، لہذا ان تمام چیزوں سے نظری دلچسپی رکھنے کے باوجود ان میں سے کسی میں کسی پہلو سے کوئی عملی حصہ لینے پر ہماری طبیعت کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ ہم اپنی مہلت عمر اور صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عظیم الشان کام کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کی خدمت میں صرف کر دینے ہی کو اصل کامیابی سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق ارزانی عطا فرمائے۔ آمین۔

'میثاق' کے اس شمارے میں ہم اپنی ڈاک میں سے چار منتخب خطوط کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں جن میں ہمارے موقف کی تائید و تحسین سے لے کر اس پر نظر ثانی کے مشورے تک ساری باتیں موجود ہیں ہمارے لئے ممکن نہیں تھا کہ اس طرح کے تمام خطوط کا جواب فرداً فرداً دے سکتے —— ایسے تمام مکتوب نگار حضرات ہماری آج کی گذارشات میں اپنے اپنے خطوط کے جوابات تلاش کر سکتے ہیں ——

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ !!   وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ہم سے طلب فرمائیں

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبرا

اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام

تالیف : اسرار احمد

* فکر مغرب کا ہمہ گیر استیلاء * بنیادی نقطۂ نظر
* عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش * مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل
* علوم عمرانی کا ارتقا * اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں
* تعبیر کی کوتاہی * احیائے اسلام کی شرط لازم : تجدید ایمان
* کرنے کا اصل کام * عملی اقدامات —— اور

مضامین مندرجہ بالا کی تائید و توثیق بعنوان

"فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر"

از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۵۶۔ طباعت آفسٹ : قیمت ایک روپیہ

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ کرشن نگر لاہور ۱۲   فون ۶۹۵۲۲

دارُالاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

عُلومِ قرآنی کی عُمومی نشرواشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجّہات قرآن حکیم کی جانب مُنعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبّت جاگزیں ہو ——— اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشرواشاعت کیلئے وقف کر دیں۔

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول —— مشتمل بر

مقدمہ و تفسیر آیۂ بسم اللہ ، سورۂ فاتحہ ، سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمرن

سائز ۲۹/۸ × ۲۲ ، صفحات ۸۸۰

عمدہ دبیز سفید کاغذ —— آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ تیس روپے —— محصول ڈاک : ڈھائی روپے

(بتیس روپے پچاس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں)

(نمونہ کے صفحات مفت طلب فرمائیں)

اس کے علاوہ **تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ** علیحدہ مطبوعہ بھی موجود ہے بذریعہ ڈاک طلب فرمانے کے لئے ۸۵ پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں

بڑا سائز - صفحات ۳۶ - ہدیہ ۷۵ پیسے

:- شائع کردہ :-

دار الاشاعۃ الاسلامیۃ لاہور

کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - 1 (فون 69522)

پبلشر : محی الدین ، طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ لاہور